中国民間故事





چینی لوک کہانیاں

تہذیب و ترجمہ

شفیع عقیل

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی



ترتیب

حرفے چند (۷)

پہلی بات (۱۰)

سُرخ چشمہ (۱۷)

سُورج کا سفر (۴۷)

بہادر شیرگار (۵۹)

جھیل کا پانی (۸۱)

سدا بہار درخت (۱۰۱)

دو بھائی (۱۲۱)

سوتیلی ماں، سوتیلی بہن (۱۴۱)

وفادار بیوی (۱۶۹)

سُرخ اور سبز پھُول (۱۸۷)

شہزادی کا رُومال (۲۲۱)

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان ۳۴۳

ناشر : انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

طابع : انجمن پریس، نشتر روڈ، کراچی

اشاعت اوّل : سنہ ۱۹۷۵ء

قیمت : ۱۲ روپے



اپنے دوست آذر زوبی کے نام

شفیع عقیل



جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

حرفے چند

انجمن کے اشاعتی منصوبے مختلف النوع ہیں۔ ترجموں کے سلسلے میں ہم دوسری زبانوں کی امہات کتب کو بھی اُردو میں چھاپنا چاہتے ہیں اور اپنی علاقائی زبانوں کے عظیم ادب کو بھی۔ اب تک انجمن نے غیر ملکی زبانوں کے جو ترجمے شائع کیے اُن کی خاصی تعداد ہے۔ ان میں جن ترجموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ان میں سے چند نام یہ ہیں۔

۱۔ مشاہیر یونان و روما۔ ترجمہ از سید ہاشمی فرید آبادی (۴ جلد)
۲۔ معاشیات کی ماہیت و اہمیت۔ ترجمہ از ابو سالم
۳۔ مکالمات افلاطون " " سید عابد حسین
۴۔ نپولین اعظم " " محمد معین الدین
۵۔ گورکی کی آپ بیتی " " ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (۳ جلد)
۶۔ فاؤسٹ (از گوئٹے) " " پروفیسر عبدالقیوم خاں باقی (منظوم ترجمہ)
۷۔ فلسفۂ جذبات " " عبدالماجد دریا بادی
۸۔ بوطیقا (تصنیف ارسطو) " " پروفیسر عزیز احمد
۹۔ اندرون ہند (از خالدہ ادیب خانم)
۱۰۔ پیاری زمین (مسز پرل بک کی کتاب GOOD EARTH) کا ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
۱۱۔ تاریخ ملت عرب (از فلپ ہٹی) ترجمہ از سید ہاشمی فرید آبادی
۱۲۔ ڈاس کیپٹال (از کارل مارکس) " " سید محمد تقی (۲ جلد)

۱۳۔ رومیو جولیٹ (از شکسپئر) ترجمہ از پروفیسر عزیز احمد

۱۴۔ شمسون مبارز (از جان ملٹن) ” ” پروفیسر مجنوں گورکھپوری

۱۵۔ خطبات و مقالات گارساں دتاسی کا ترجمہ (چار جلدوں میں)

ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ سید عابد حسین

پروفیسر عزیز احمد۔ سر راس مسعود۔ ڈاکٹر حمید اللہ۔

۱۶۔ گُندمالا (سنسکرت ڈراما) از دن نگا اچاریہ۔ ترجمہ از حمدانی نقوی

اپنی علاقائی زبانوں کے سلسلے میں اب تک ہم نے مندرجہ ذیل کتابیں چھاپی ہیں:۔

۱۔ پیامِ شباب از قاضی نذر الاسلام ترجمہ۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

۲۔ ابیات سلطان باہوؒ ترتیب و ترجمہ۔ عبد المجید بھٹی

۳۔ پشتو شاعری، مرتّبہ فارغ بخاری و رضا ہمدانی۔

۴۔ پنجابی کے پانچ قدیم شاعر۔ از شفیع عقیل

۵۔ موج موج مہران (جدید سندھی شعراء کا منتخب کلام)

اُردو منظوم ترجمہ: الیاس عشقی

مرتّبہ: مراد علی مرزا

اس سلسلے کی چھپٹی کتاب "بلوچی زبان و ادب" کے متعلق زیر تصنیف ہے۔

اب ہم نے سوچا ہے کہ عظیم غیر ملکی زبانوں کی" لوک کہانیاں بھی اردو میں چھاپی جائیں۔ اِس تجویز کی افادیت خود تجویز سے ظاہر ہے۔ سوال اس پر عمل کا تھا۔

ہم جناب شفیع عقیل کے ممنون ہیں کہ انھوں نے چینی لوک کہانیوں کا ترجمہ کر کے ہمارے اس منصوبے کا ایک شاندار آغاز کر دیا۔ پہلے وہ صحافتی دُنیا اور محفلِ شعرا میں مشہور تھے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے تحقیقی کاموں پر توجہ کی۔ پنجابی کے عظیم ادب پاروں پر بطور خاص کام کیا۔ خود انجمن نے ان کی ایک نہائت قابلِ قدر تحقیق "پنجابی کے پانچ قدیم شاعر" شائع کی اور علمی حلقوں نے اس کی بڑی ستائش کی۔

اب انھوں نے کئی دوسری لوک کہانیاں انگریزی میں پڑھ کر اُن کے سلیس اُردو

میں ترجمے شروع کردیے ہیں۔ یہ کتاب اُن کا دوسرا ترجمہ ہے۔ پہلا ترجمہ جرمن لوک کہانیوں پر مشتمل ہے (اسے ایک اور ناشر چھاپ رہا ہے) ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے حصے میں عظیم چین کے عظیم عوام کا ثقافتی ورثہ آیا ہے۔

جناب شفیع عقیل کا دیباچہ اس ترجمے کے تقریباً تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اور ہم اس کے لیے بھی ان کے ممنون ہیں۔ وہ خود محنت نہ کرتے تو ہمیں کسی اور سے دیباچے کی درخواست کرنی پڑتی۔ ہاں! ایک بات اب بھی کہنی ہے۔ ہم یہ دعوٰی نہیں کرسکتے کہ یہ کہانیاں پورے چین کی نمائندہ یا ان میں سے بہترین کہانیاں ہیں۔ چین بہت بڑا ملک بھی ہے اور بہت قدیم بھی۔ چین کے عوام دنیا کے قدیم ترین اور سب سے کثیر التعداد عوام ہیں۔ ان کی نمائندہ بہترین کہانیاں بھی ایک مختصر سی کتاب میں کیسے سما سکتی ہیں، لیکن اس میں قصور کسی کا نہیں۔ جناب شفیع عقیل نے ایک انگریزی انتخاب پر بھروسا کیا ہے اور فی الحال یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ ہمیں تو اس بات کی خوشی ہے کہ اُردو زبان چینی لوک کہانیوں سے متعارف ہوگئی۔ اب آئندہ خود شفیع عقیل صاحب ہمت کریں یا کوئی اور اہلِ دل توجہ کرے تو انجمن یہ سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے ہر ممکن تعاون کرنے کو حاضر ہے۔

کیا ہم توقع کریں کہ یہ نادر کتاب پاکستانی کتب خانوں کے لیے خریدی جائے گی۔ یہ اُردو میں چینی لوک کہانیوں کی پہلی کتاب ہے جو اتنی ضخامت بھی رکھتی ہے اور رواں سلیس زبان میں بھی ہے پاکستان اور چین ایک دوسرے سے قریب تو آچکے ہیں مگر گہری مفاہمت کے لیے ایک دوسرے کی زندہ روایات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ یہ کام صرف حکومتوں ہی کا نہیں دونوں ملکوں کے عام آدمیوں کا بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ چین میں پاکستانی مزاج کے سمجھنے کے لیے بہت کام ہو رہا ہے پاکستان میں چینی عوام کا مزاج جاننے کے لیے ان کے جدید انقلابی خیالات و عمل کو جاننے کے ساتھ ساتھ ان کی لوک کہانیوں سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے میں خاصا مواد فراہم کرتی ہے۔ اسے چھاپ دینا ہماری ذمہ داری تھی۔ اِسے زیادہ سے زیادہ پھیلانا دوسرے پاکستانیوں کی ذمہ داری ہے۔ بشرطیکہ وہ پوری کی جائے۔



پہلی بات

لوک کہانی کسے کہتے ہیں — ؟ اس کی تعریف کیا ہے — ؟ ادب میں اس کی کیا حیثیت ہے — ؟ سماج سے اس کا کیا رشتہ ہے — ؟ وہ زندگی کا ساتھ کہاں تک دیتی ہے — ؟ اور پھر یہ کہ وہ تاریخ کا کتنا سفر طے کر کے ہم تک پہنچی ہے — ؟ اس نے کن کن مراحل سے گزر کر موجودہ صورت اختیار کی ہے — ؟ اور مختلف ملکوں کی لوک کہانیوں میں جو اکثر باتیں مشترک پائی جاتی ہیں ان کی وجوہ کیا ہیں — ؟ ان تمام سوالات پر میں اپنی کتاب "پنجابی لوک داستانیں" میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں اس بحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں میں صرف زیرِ نظر کتاب کے بارے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے تو میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ یہ کتاب میں نے کسی وقتی جذبے یا فوری رجحان کے تحت مکمل نہیں کی۔ عوامی جمہوریہ چین ہمارا عظیم دوست ہے اور اس سے ہمارے مضبوط اقتصادی اور سیاسی رشتے ہیں۔ یہ بات درست ہے مگر میں نے یہ کتاب محض ادبی نقطۂ نظر سے تحریر کی ہے۔ لوک ادب میرا پسندیدہ موضوع ہے اور یہ کتاب اسی ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ میں نے اس زمانے میں تین چینی لوک کہانیوں کو اردو کا روپ دیا تھا جو روزنامہ "جنگ" میں شائع ہوئی تھیں انھیں پڑھ کر ایک دو دوستوں نے اصرار کیا کہ اسی موضوع پہ کتاب کی تکمیل کروں۔

خود میرا بھی یہی ارادہ تھا اور میں نے یہ کہانیاں اسی نیت سے اردو میں منتقل کی تھیں لیکن وقت کی کم یابی آڑے آگئی ۔ مصروفیات کی زنجیر طویل ہوتی چلی گئی اور مجھے اس طرف توجہ دینے کی مہلت نہ مل سکی ۔ حالانکہ اس دوران میں تین چار دوسری کتابیں لکھ دیں، تاہم یہ کام صرف تین کہانیوں تک ہی محدود رہا ۔ ۱۹۷۴ء میں ایک بار پھر ارادہ کیا اور اس کی طرف متوجہ ہوگیا ۔ وقت کی بے رحمی تو اب بھی ساتھ تھی لیکن اس بار میں نے اس کی تکمیل کر کے ہی دم لیا اور اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے ۔ پہلے خیال یہ تھا کہ کم از کم بیس کہانیاں ہونی چاہئیں مگر بعد میں دس کہانیوں پر ہی اکتفاء کر لیا ۔ دراصل مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اپنے پر بیس کہانیوں کی پابندی عائد کر لی تو کہیں پہلے کی طرح پھر یہ کام جوں کا توں ہی نہ رہ جائے ۔ یہی کچھ سوچ کر دس کہانیاں ہی پیش کر رہا ہوں

میں نے کتاب کی ابتداء میں محض ترجمہ لکھنے کی بجائے تہذیب و ترجمہ لکھا ہے' میں اس کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔

اگر آپ نے دنیا کے مختلف ممالک کی لوک کہانیوں کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کہانیاں اکثر و بیشتر اختصار سے لکھی ملتی ہیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض کہانیاں طویل بھی ہوتی ہیں مگر زیادہ تعداد ایسی کہانیوں کی ہے جو نہایت مختصر طور پہ قلم بند کی ہوتی ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ ان کا انداز بھی بیانیہ ہوتا ہے ۔ ان میں مکالمے نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور واقعات و حالات کی عکاسی نہیں ہوتی ۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس سے ان کہانیوں کی دل کشی، حسن اور دل چسپی میں بڑی حد تک کمی ہو جاتی ہے ۔

پنجابی زبان کے نامور مستشرق محقق سر رچرڈ ٹمپل SIR RICHARD TAMPLE نے اپنی مشہور کتاب "لیجنڈس آف پنجاب" LEGENDS OF PUNJAB کے دیباچہ میں ایک جگہ لوک کہانیوں پہ اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۔

"کوئی وجہ نہیں کہ انھیں ادبی لحاظ سے تاحد امکان دل چسپ نہ بنایا جائے بشرطیکہ ان کی صحت میں فرق نہ آنے پائے ۔"

میں نے اسی مقولے پر عمل کیا ہے ۔ وہ اس طرح کہ ان کہانیوں کے کردار، مقامات'

واقعات، حالات، غرض ہر چیز اصل کے مطابق ہے۔ میں نے کسی کہانی کے پلاٹ اور اس کے تانے بانے میں کوئی تبدیلی یا فرق نہیں آنے دیا، البتہ مکالموں میں اجتہاد کیا ہے کہانی کے ماحول اور اس ماحول کے رسم و رواج، کرداروں کی حرکات و سکنات اور احساسات و جذبات کی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیشتر جگہوں پر مکالموں کا اضافہ کیا ہے تاکہ دل کشی کے ساتھ ساتھ کہانی میں روانی پیدا ہو سکے۔ یہ بات اس لیے بھی ضروری تھی کہ اکثر کہانیوں میں مکالمے نہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے والے کو تحریر میں جھٹکے سے محسوس ہوتے ہیں۔ کہانی کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور دل چسپی میں کمی آجاتی ہے۔ میں نے مکالموں کی مدد سے یہ تسلسل ٹوٹنے نہیں دیا اور کہانی کی دل چسپی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے انداز بیان میں لفاظی سے بھی کام لیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا اکثر لوک کہانیوں میں صرف ایک جملے ہی میں کوئی پورا واقعہ بیان کر دیا جاتا ہے ــــ یا لکھنے اور کہنے والا صرف ایک سطر ہی میں کسی مقام سے گزر جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پہ میں نے ماحول کی عکاسی کے لیے زبان سے فائدہ اُٹھایا ہے تاکہ کہانی کا تاثر اور گہرا ہو جائے۔ اس کا حسن اور نکھر کر سامنے آئے اور قاری کا ذہن اور دل دونوں ساتھ ساتھ رہیں۔ اس کے علاوہ چار کو چھوڑ کر باقی کہانیوں کے آخر میں چند سطروں کا پیرا میں نے خود تحریر کیا ہے جس میں کہانی کا مجموعی تاثر اور مقصد پیش کیا گیا ہے ــــ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، وہ میں نے آسان سے آسان اور سہل سے سہل استعمال کی ہے اس قسم کی کہانیوں کے لیے یہی انداز مناسب ہے۔ دقیق اور بوجھل الفاظ لوک کہانی کی سادگی اور تاثر کو مجروح کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ کہانی کی دل چسپی اور اس کا حسن برقرار رکھنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس طرح میں نے ان کہانیوں کا محض ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ تہذیب بھی کی ہے اور اسی لیے تہذیب و ترجمہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ تاہم یہ بات میں ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اصل کہانی، اس کے پلاٹ اس کے واقعات اور اس کے کرداروں میں کہیں تبدیلی نہیں آنے دی ــــ اگر ایسا کیا جاتا تو پھر اس کتاب کو اردو میں پیش کرنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

یہ تمام کہانیاں چین میں صدیوں سے کہی سُنی جارہی ہیں اور ان کا سفر سینہ بہ سینہ ہوتا ہے۔ یہ ایسا ثقافتی اور تہذیبی ورثہ ہے جو ہر دور میں زندہ رہتا ہے۔ لوک کہانیاں ہوں یا لوک گیت، وقت ان میں تبدیلیاں تو لا سکتا ہے مگر ختم نہیں کر سکتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لوک ادب کسی ایک آدمی کی تخلیق نہیں ہوتا۔ اس میں نسلوں کے جذبات و احساسات اور صدیوں کے تجربات سموئے ہوتے ہیں ـــ یہ تمام انسانوں کی مشترک تخلیق ہوتی ہے اور اسے تمام انسان مل کے اپنے دلوں اور ذہنوں میں زندہ رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں شامل لوک کہانیوں کے موضوعات مختلف ہیں۔ کہیں سوتیلی ماں کا ظلم ہے، کہیں ایک چالاک بھائی دوسرے بھائی سے دھوکا کرتا ہے، کہیں بیوی کی بے لوث وفاداری ہے۔ کہیں کسی جابر بادشاہ کا ظلم ہے، کہیں نیکی کا صلہ ہے، کہیں دوسروں کے لیے ایثار ہے کہیں کسی مقصد کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد ہے، کہیں شیطانی قوتوں سے مردانہ وار مقابلہ ہے اور کہیں دوسروں کی بھلائی کے لیے دُکھ جھیلے جاتے ہیں ـــ ان میں ماں کی ممتا بھی ہے، دوسروں کی محبت بھی ہے، روایات کی فرسودگی بھی ہے اور ان فرسودہ روایات کو بدلنے کا عزم بھی ملتا ہے ـــ اس طرح ان میں چاہت کی آگ بھی ہے، سماج کا جبر بھی ہے، مسلسل کوشش بھی ہے نیک ارادوں کی تکمیل بھی ہے، اور انتظار کے بعد وصال بھی ہے ـــ غرض ان کہانیوں میں وہ تمام انسانی دُکھ سُکھ ملتے ہیں جن سے زندگی عبارت ہے۔ مگر ایک چیز ان تمام کہانیوں میں مشترک ملے گی ـــ اور وہ ہے اپنے مقصد کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد اور ظلم و جبر کے خلاف نفرت ـــ صرف نفرت ہی نہیں بلکہ اس کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کی ترغیب اور اسے شکست دینے کا حوصلہ ـــ یہ دو باتیں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی روپ میں، کسی نہ کسی کنائے اشارے میں، اور کسی نہ کسی ڈھنگ سے ہر کہانی میں موجود ہیں ـــ میری ذاتی رائے میں ان کہانیوں کا یہ مقصدی پہلو ان کی افادیت اور

اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

اب میں یہ بھی بتا دوں کہ ان کہانیوں کے حصول کے لیے میرا ذریعہ کیا ہے ___ پہلی بات تو یہی ہے کہ میں چینی زبان نہیں جانتا۔ میں نے انگریزی کے توسط سے انھیں اردو کا روپ دیا ہے ___ ان میں سے چار کہانیاں بہادر شیگار، وفادار بیوی، جھیل کا پانی، اور دو بھائی FOLK TALES FROM CHINA کی پہلی جلد سے لی گئی ہیں۔ یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۶۲ء میں FOREIGN LANGUAGES PRESS کی طرف سے پیکنگ سے شائع ہوا چار کہانیاں سورج کی تلاش، سوتیلی ماں سوتیلی بہن، سُرخ اور سبز پھول، اور سُرخ چشمہ، اسی سلسلے کی چوتھی جلد میں سے لی گئی ہیں۔ یہ بھی مذکورہ ادارے کی طرف سے شائع ہوئی اور ۱۹۵۸ء میں طبع کی گئی ___ ان کے علاوہ کہانی "سدا بہار درخت" ایک مختصر سی تصویری کتاب AS EVERGREEN AS THEFIR سے لی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی ۱۹۵۶ء میں پیکنگ سے شائع ہوئی اور فارن لینگویجز پریس کی طرف سے طبع کی گئی۔ دسویں کہانی "شہزادی کا رومال" لندن سے شائع ہونے والے ایک ہفت روزہ THE TREATURE سے لی گئی ہے۔ اس رسالے میں FOLK TALES OF MANYLANDS کے عنوان کے تحت لوک کہانیوں کا ایک سلسلہ چھپتا تھا جس میں مختلف ممالک کی کہانیاں شامل ہوتی تھیں ___ یہ کہانی بھی اسی سلسلے میں شائع ہوئی تھی جس کا میں نے تہذیب و ترجمہ کر لیا ___ یہ ان دس کہانیوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اسی ضمن میں ایک بات اور کہنے کی ہے اور وہ یہ کہ میں نے دو کو چھوڑ کر باقی تمام کہانیوں کے نام اردو میں تبدیل کر دیئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ محض لفظی ترجمے سے کہانی کے عنوان میں حسن پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ میں نے کہانی کے مقصد اور پلاٹ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے نیا نام دے دیا ہے تاکہ اردو کے مزاج میں ڈھل جائے ___ تاہم اردو ناموں کے ساتھ ساتھ انگریزی عنوان بھی لکھ دیئے

گئے ہیں۔ اس سے آگے کام کرنے والوں کو حوالہ اور تحقیق میں آسانی ہوگی۔
ان کہانیوں میں جو قلمی خاکے شامل ہیں یہ بھی مذکورہ بالا کتابوں میں سے شکریہ کے ساتھ لیے گئے ہیں۔

آخر میں مجھے دو دوستوں کا ذکر کرنا ہے — ایک میرے محترم دوست جمیل الدین عالی ہیں جنھوں نے ہمیشہ میری ہمت بندھائی، مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا ہے — اور دوسرا میرا ہم مشرب یار آذر زوبی ہے جس کا مجھے شکریہ ادا نہیں کرنا۔ اس لیے کہ اس کتاب کا انتساب انہی کے نام ہے۔

شفیع عقیل

20. 1. 75.

کراچی

سُرخ چشمه

THE RED SPRING



اگلے وقتوں کی بات ہے، چین کے کسی علاقے میں ایک گاؤں آباد تھا۔ اس گاؤں میں ایک نوجوان رہتا تھا جس کا نام شی تن تھا۔ یہ نوجوان بڑا محنتی، دیانت دار، صحت مند اور خوب صورت تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور وہ اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ جب وہ جوان ہو گیا تو اس کی ماں کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ اس نے گاؤں ہی کی ایک اچھی سی لڑکی کا انتخاب کیا اور بہار کے ایک موسم میں شی تن کی شادی ہو گئی۔ اس کی بیوی کا نام جیڈ ے فلاور تھا اور وہ اس قدر حسین و جمیل تھی، جتنا کہ کسی عورت کے بارے میں تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ صرف حسین ہی نہیں بلکہ ایک بیوی کی حیثیت سے بھی وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ سلیقہ مند، سگھڑ اور گھر کو سنوارنے بنانے والی۔ اس کے آنے سے شی تن کے گھر کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اس کے لیے ایک نئی زندگی اپنے ساتھ لائی ہو۔ شی تن اپنی قسمت پر بہت خوش تھا کہ اسے ایسی حسین و جوان بیوی ملی ہے جو سلیقہ مندی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ وہ دونوں ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ انسان کا وقت بدلتے دیر نہیں لگتی، نیکی اور اچھائی کا ہمیشہ اچھا ہی صلہ نہیں ملتا، اور یہی کچھ شی تن اور جیڈے فلاور کے ساتھ ہوا۔ شی تن کی سوتیلی ماں ایک ظالم اور بے حس عورت تھی۔ وہ بے حد چڑچڑی اور بد مزاج تھی۔ اسے اپنے سوا کسی اور میں کوئی خوبی ہی نظر نہ آتی تھی۔ خاص طور پر بے چاری جیڈے فلاور میں تو اسے

بُرائیوں کے علاوہ کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ وہ اس کی بات بات میں بلاوجہ نقص نکالتی اور ہر کام میں بُرائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتی۔ اس کے پکائے ہوئے کھانے میں طرح طرح کے نقص ڈھونڈتی اور ہر وقت اسے پھوہڑ ثابت کرنے کے درپے رہتی۔ اسے اس بات کا احساس تک نہ ہوتا کہ بے چاری جیڈے فلاور کس قدر محنت، دھیان اور سلیقے سے کھانا تیار کرتی ہے۔ کتنی احتیاط اور محبت سے اسے پیش کرتی ہے۔ اسے تو صرف نقص نکالنا ہوتا تھا چاہے کھانا کتنا ہی اچھا اور لذیذ کیوں نہ پکا ہو۔ وہ ہر وقت جیڈے فلاور کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی۔ بات بات پر ٹوکتی اور وقت بے وقت جھڑکیاں دیتی رہتی۔ کبھی کہتی

"تم نے مجھے اس قدر گرم چاول دے دیئے ہیں کہ میرا منہ جل گیا ہے!"

اس پر جیڈے فلاور چاول ذرا ٹھنڈے کر کے پیش کرتی تو وہ اُلٹا ڈانٹنے لگتی۔

"یہ چاول ہیں ——؟ برف کی طرح ٹھنڈے کر کے میرے آگے رکھ دیئے ہیں!"

"اگر وہ کسی روز ذرا جلدی کھانا تیار کر کے پیش کرتی تو بے رحم ساس وجہ پیدا کرتے ہوئے چمک کر کہتی۔

"یہ کھانے کا وقت ہے ——؟ اتنی جلدی کھانا کون کھاتا ہے۔ تمہیں سلیقہ کب آئے گا؟"

اور اگر وہ جلدی کھانا نہ دیتی تو پھر بھی جھگڑنے لگتی۔

"اس قدر دیر میں کھانا دینے کا کیا مقصد ہے ——؟ کیا تم سے جلدی نہیں پکایا جاتا ——؟"

غرض بات بات پر ٹوکنا اس کی فطرت تھی۔ حالانکہ بے چاری جیڈے فلاور اس کے ڈر کی وجہ سے کھانا پکانے میں خاص طور پر احتیاط برتتی تھی مگر اس کی ساس اسے جھڑکنے اور ڈانٹنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر ہی لیتی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اسے مارنے پیٹنے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔

ادھر سُنی تن یہ سب کچھ دیکھتا اور اپنے دل ہی دل میں کُڑھتا رہتا۔ وہ اپنی ماں سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا اور جیڈے فلاور کی بے بسی بھی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

جب اس کی ماں جیڈ ے فلاور کو اس طرح بے قصور دانستہ یا پیٹتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اسے ستایا جا رہا ہو، جیسے اسے پیٹا جا رہا ہو۔ مگر وہ مجبور تھا محض اپنے آپ ہی پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ اس زمانے میں یہ بات بُری نہیں سمجھی جاتی تھی کہ کوئی ساس اپنی بہو کو مارتی ہے بلکہ یہ ایک عام سی بات تھی۔ ہر ساس کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی بہو کو پیٹ سکتی ہے۔ بیٹا اس معاملے میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شی تن اس سلسلے میں بے بس تھا۔

دن رات کی اس ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیڈ ے فلاور کی صحت گرنے لگی۔ وہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہونے لگی۔ اس کی خوب صورتی مرجھا گئی اور چہرے کی سرخیاں دھیمی پڑ گئیں۔ وہ جب اس گھر میں آئی تھی، اس وقت اس کے حسن پہ نظر نہ ٹکتی تھی لیکن اب اس کی حالت ہی اور تھی۔ نہ سُرخی دکھائی دیتی تھی اور نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آتی تھی۔

ایک روز جب شی تن گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا، جیڈ ے فلاور چارپائی کی پٹی پہ اداس اور غمگین بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اس کے لبوں پہ آہیں تھیں اور وہ غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ شی تن نے ایک نظر اسے دیکھا تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"بے چاری میری خاطر کس قدر ظلم و ستم برداشت کر رہی ہے!"

اس نے اپنے دل میں سوچا۔ اس کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ وہ ہولے ہولے قدم بڑھاتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ پا کر جیڈ ے فلاور نے نظریں اٹھائیں۔ جوں ہی اس نے شی تن کو اپنے سامنے دیکھا اس کے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے اور ہچکیاں بندھنے لگیں۔

"پیارے شی تن!"

اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"تم جانتے ہو، میں نے حد سے زیادہ ظلم برداشت کیے ہیں۔ مگر اب مزید ظلم اور تکلیف برداشت کرنا میرے بس سے باہر ہے!"

اس نے اتنا کہا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ شی تن اس کے دُکھ دیکھ دیکھ کر پہلے ہی بڑا دُکھی تھا اور اب جو اس نے اسے اس طرح بلک بلک کر روتے دیکھا تو اس کا دل بھی بے قابو ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی۔

"پیاری جیڈ ے فلاور۔ ا تم نہیں جانتیں تم پر ظلم ہوتا دیکھ کر مجھے کتنا دُکھ ہوتا ہے"

جواب میں جیڈ ے فلاور بدستور سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"میرے لیے مصیبت یہ ہے کہ اب میں مزید یہ ظلم بھی برداشت نہیں کر سکتی اور تمھیں اکیلا چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی"

اس وقت شی تن کا دل بری طرح رو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم گھبراؤ نہیں — ہمیں اس ظلم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی ترکیب نکالنی چاہیے!"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بڑے دکھ کے لہجے میں بولا۔

"اگر تم اسی طرح میری سوتیلی ماں کے ساتھ رہیں تو ایک روز روتے روتے جان دے دو گی"

پھر جیسے اسے کوئی ترکیب سوجھ گئی۔ وہ جلدی سے کہنے لگا۔

"میری مانو تو ہم آج رات اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر کہیں دُور چلے جاتے ہیں۔ ہم کہیں بھی جیسے تیسے زندگی گزار لیں گے لیکن اس روز روز کے ظلم سے تو نجات مل جائے گی —؟"

اس کے اتنا کہنے پر جیڈ ے فلاور نے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی۔ وہ ایک لمحہ تک اسے خاموشی سے دیکھتی رہی اور پھر دکھ بھری آواز میں بولی۔

"ہاں — ! اب یہی ایک راستہ ہے!"

چنانچہ جوں ہی شام گزری اور آدھی رات کا سماں سر پر آیا وہ دونوں چپکے سے اٹھے۔ دبے پاؤں اصطبل میں گئے۔ وہاں سے انھوں نے دو اچھے گھوڑے کھولے

جو تیز رفتار اور پتلے جسم کے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے دھیرے دھیرے اصطبل کا پچھلا دروازہ کھولا۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے، اور شمال مغرب کی جانب چل دیئے۔

یہ ایک عام کہاوت ہے کہ تیز رفتار گھوڑا شہاب ثاقب سے بھی زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ چونکہ ان دونوں کے گھوڑے پتلے جسم کے پھرتیلے اور طاقتور تھے اس لیے اور بھی برق رفتاری سے سفر کر سکتے تھے۔ جوں ہی انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی وہ ہوا سے باتیں کرنے لگے اس وقت شی تن اور جیڈے فلاور کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں ––؟ اور انہیں کدھر جانا چاہیے ––؟ انھیں صرف اس قدر معلوم تھا کہ انھوں نے گھر سے نکل کر شمال مغرب کی جانب اپنا سفر شروع کیا ہے اور بس!

گھوڑے برق رفتاری سے سرپٹ دوڑے چلے جا رہے تھے اور وہ یہ جانے بغیر کہ اس وقت کہاں ہیں، اپنے سفر پہ رواں دواں تھے۔ کئی علاقے آئے اور گزر گئے، کئی گاؤں راستے میں پڑے اور نکل گئے۔ کہیں پہاڑ آئے اور کہیں میدان، کہیں سبزہ ملا اور کہیں خشکی مگر وہ کہیں نہ رُکے۔ انھوں نے اپنا سفر مسلسل جاری رکھا۔ بہت سا سفر طے کرنے کے بعد جب وہ ایک پہاڑی راستے پر جا رہے تھے تو شی تن، جیڈے فلاور کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"گھوڑے چوڑے راستے پر اچھا نہیں دوڑتے –– چھوٹا پہاڑی راستہ اختیار کرنا چاہیے!"

یوں لگتا تھا جیسے گھوڑے شی تن کی بات سمجھ گئے ہوں۔ وہ خود بخود چوڑا راستہ چھوڑ کر ایک چھوٹے راستے پہ ہو لیے جو چٹانوں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ یہ راستہ سیدھا اور ڈھلوان تھا اور نشیبی علاقے کی طرف جاتا تھا۔ پتھریلا ہونے کی وجہ سے جب گھوڑے اس پہ دوڑ رہے تھے تو ان کے کُھر چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکراتے، ان سے آوازیں پیدا ہوتیں جو اس سنسان فضا میں گونج گونج جاتیں۔ شی تن اور جیڈے فلاور اسی طرح سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں چاروں طرف پہاڑ تھے۔ یہاں کوئی آبادی دکھائی نہ دیتی تھی البتہ بہار کا موسم ہونے کی وجہ سے

ہر طرف ہری ہری گھاس کا تختہ بچھا ہوا تھا۔ خود رو پھول پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور ان کی خوشبو نے فضا میں عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔ دُور دُور تک بچھے ہوئے سبزے میں رنگا رنگ کے پھول بڑا دل کش منظر پیش کر رہے تھے۔ آسمان پہ کونجوں کی قطاریں خوشی میں بڑی سبک رفتاری سے پرواز کرتی نظر آ رہی تھیں اور درختوں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے پرندے چہچہا رہے تھے۔ جیڈے فلاور نے بڑی حسرت سے یہ پُر بہار منظر دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی :-

"اس دھرتی پہ ہر شخص کا گھر ہے ــــ یہاں تک کہ پرندوں کے بھی رہنے کے لیے گھونسلے ہیں"۔

اتنا کہہ کر اس نے ستی تن کی طرف دیکھا اور کہنے لگی :-

"مگر ہمارا گھر کہاں ہوگا ــــ؟ وہ وقت کب آئے گا جب ہمارا بھی اپنا گھر ہوگا جہاں ہم دونوں رہیں گے ــــ؟"

جواب میں ستی تن نے اسے دلاسہ دیا :-

"گھبراؤ نہیں ــــ یہ مصیبت وقتی ہے ــــ بہت جلد تمھاری یہ تمنا پوری ہو جائے گی"۔

اس پر جیڈے فلاور اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی :-

"میں اپنی زندگی میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی کہ میں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہوں ــ میری صرف یہی تمنا ہے کہ ہم دونوں زندگی بھر اکٹھے رہیں ــــ اس کے علاوہ میری کوئی تمنا نہیں ہے"۔

دونوں وہاں تھوڑی دیر کو سستانے کے لیے رُکے اور پھر اپنے سفر پہ چل دیئے اس سفر پہ جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے ــــ اسی طرح وہ دن بھر سفر کرتے رہے ــــ راستے میں ایک بہت بڑی گھاٹی آئی جس پہ دھند کی گہری چادر پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے اسے بھی پار کیا۔ پھر ایک ڈھلوان چٹان سے گزر کر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک بہت بڑا پہاڑ تھا۔ اس پہاڑ کی چوٹی اوس کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھی اور

اس کے دامن میں میدانی علاقہ تھا۔ دن بیت چکا تھا اور شام سر پہ تھی۔ وہ دونوں مسلسل سفر سے تھک چکے تھے۔ چنانچہ شی تن کہنے لگا

"میرا خیال ہے، ہمیں یہیں کہیں رات بسر کرنی چاہیے ——؟"

"یہاں تو دور دور تک کوئی آبادی نظر نہیں آتی ——!"

جیڈے فلاور نے مایوسی سے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ اپنے آپ سے بات کر رہی ہو۔

"ہم یہاں کسی غار یا درختوں کے جھنڈ میں رات بسر کر سکتے ہیں"

شی تن نے اتنا کہا اور اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں جیڈے فلاور نے بھی اپنا گھوڑا روک لیا اور وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ قریب ہی درخت تھے، انھوں نے وہاں گھوڑے باندھ دیے اور خود ایک محفوظ جگہ دیکھ کر رات بسر کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

دوسرے روز صبح ہی صبح منہ اندھیرے بیدار ہو کر انھوں نے گھوڑوں کو تیار کیا اور سوار ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب سورج نکل آیا تو وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو پہاڑوں کے درمیان واقع تھی۔ یہ ایک میدان سا تھا جہاں ایک چشمہ بھی تھا۔ انھوں نے گھوڑے روک لیے اور یہ دیکھ کر دونوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ اس چشمے کا پانی چیری کے پھولوں کی پتیوں کی طرح سرخ تھا۔ اس سرخ پانی سے ایسی روشنی اور چمک نکل رہی تھی جیسی نیلے آسمان پر چاند سے نکلتی ہے۔ اس عجیب و غریب چشمے کے ارد گرد جو جنگلی پھول اور گھاس اگی ہوئی تھی ان میں سے بھی سرخ روشنی پھوٹ پھوٹ کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ جیڈے فلاور نے محسوس کیا کہ چاروں جانب سے زبردست خوشبو آ رہی تھی۔ یہ خوشبو اس چشمے سے آ رہی تھی، ان جنگلی پھولوں سے نکل رہی تھی یا اس گھاس میں سے ——؟ اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن خوشبو اتنی تیز اور دل فریب تھی کہ نس نس میں اترتی جا رہی تھی۔ اس سے دل و دماغ تر و تازہ ہو رہے تھے۔

"ہم ابھی تک تھکے ہوئے ہیں —— اور گھوڑوں کو بھی مزید آرام کی ضرورت ہے"

جیڈے فلاور کہنے لگی :-

"یہ جگہ بڑی دل کش اور خوب صورت ہے کیوں نہ کچھ دیر یہاں آرام کر لیا جائے ___؟"

"تمھارا خیال ٹھیک ہے ___ ہمیں یہاں تھوڑی دیر آرام کر لینا چاہیے!"

شی تن نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ اور وہ دونوں اپنے گھوڑوں سے اتر آئے۔ انھوں نے چشمے کے قریب گھوڑوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود چشمے کے کنارے آگئے۔ چشمے کا سُرخ پانی شیشے کی طرح صاف و شفاف تھا جیڈے فلاور کو پیاس محسوس ہو رہی تھی، اس نے بیٹھ کر دونوں ہاتھ پانی میں ڈالے اور پھر چلّو میں پانی بھر کر ایک گھونٹ پیا چشمے کا یہ سُرخ پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔ جوں ہی جیڈے فلاور نے گھونٹ بھرا اور پانی اس کے حلق سے نیچے اُترا، اس نے محسوس کیا کہ اس کے سارے جسم میں حدت سی دوڑ گئی ہے اس کی نس نس میں حرارت پھیل گئی تھی ___ اور پھر جیسے ہی وہ پانی پی کر کھڑی ہوئی شی تن نے دیکھا کہ اس کا حُسن پہلے سے کہیں زیادہ نکھر آیا تھا۔ حُسن و جوانی کی سُرخیاں اور زیادہ کُھل گئی تھیں۔ وہ اس وقت سے بھی زیادہ خوب صورت اور بھرپور جوان نظر آرہی تھی جب وہ پہلے پہل شی تن کے گھر میں آئی تھی۔ اس کا چہرہ دہکتے ہوئے شُعلوں سے بھی زیادہ سُرخ تھا اور اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک آگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دُنیا بھر کا حُسن اس پر اُمڈ آیا ہو۔ شی تن یہ سب کچھ بڑے تعجب سے دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ انھوں نے چونک کر اس طرف دیکھا تو اور بھی حیران رہ گئے۔ ان کے گھوڑوں کا حلیہ بدل چکا تھا۔ ان کی جلد چمکیلی اور جسم موٹے ہو گئے تھے۔ اس اچانک غیر معمولی تبدیلی سے شی تن اور جیڈے فلاور انتہائی متعجب تھے۔

"یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ___ ؟!"

"اس پانی اور گھاس میں کیسی تاثیر ہے ___ ؟!"

اس وقت حیران ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں قدرے خوف زدہ بھی تھے کیونکہ یہ ایک ناقابلِ یقین بات ہوئی تھی۔ وہ دونوں سوچنے لگے۔

"جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جانا چاہیے ___ کہیں کوئی مصیبت ہی نہ آجائے!"

یہ سوچتے ہی دونوں جلدی سے اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور گھوڑوں کو ایڑ لگا کر باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ اس طرح وہ بہت تیزی سے پہاڑوں میں گھرے ہوئے اس علاقے سے دُور نکل گئے اور پھر سے اپنا سفر جاری کر دیا۔

گو وہ اس علاقے سے دُور نکل آئے تھے مگر ان کی حیرانی کم ہونے کی بجائے اور زیادہ ہو گئی تھی کیونکہ ان کے گھوڑے موٹے ہونے کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہو گئے تھے۔ ناہموار اور پتھریلے راستے پہ وہ اس طرح سرپٹ دوڑ رہے تھے جیسے کسی صاف اور ہموار راستے پہ چل رہے ہوں۔ سرپٹ دوڑے چلے جا رہے تھے۔ اس طرح وہ نہ جانے کتنا عرصہ تیز رفتاری سے سفر کرتے رہے۔ انھیں اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کس قدر فاصلہ طے کر گئے ہیں ــــ انھوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو نیلے رنگ کے بڑے بڑے دھندلے پہاڑ افق میں غائب ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

اُس روز چلتے چلتے جب شام ہو گئی تو شی تن اور جیڈے فلاور ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ گاؤں کے باہر مٹی جھونپڑیاں تھیں جن میں چراغ روشن تھے اور روشنی چھن چھن کر جھونپڑیوں سے باہر آ رہی تھی۔

"شاید یہاں رات بسر کرنے کے لیے کوئی جگہ مل جائے؟"

شی تن اور جیڈے فلاور نے ایک دوسرے سے کہا اور دونوں گھوڑوں سے نیچے اُتر آئے۔ گھوڑوں کو ایک طرف درخت سے باندھا اور خود آگے بڑھ کر ایک جھونپڑی کے دروازے پہ دستک دی۔ چند ہی لمحوں بعد اس جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت باہر آئی۔ اس نے دو اجنبیوں کو اپنے دروازے پہ کھڑے دیکھا تو ذرا دیر کے لیے حیران سی ہو گئی۔ اس نے سوالیہ انداز میں ان کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"تم لوگ کون ہو ــــ؟ مجھے تم یہاں کے مقامی باشندے معلوم نہیں ہوتے ــــ؟"

پیشتر اس کے کہ شی تن یا جیڈے فلاور اسے کوئی جواب دیتی، وہ پھر خود ہی بولی۔

"تم کیا چاہتے ہو ــــ؟ اس طرح میرے دروازے پہ دستک دینے سے تمھارا کیا

مقصد ہے ـــــ ؟"

" اے نیک دل ماں !"

جواب میں جیڈے فلاور منت کے لہجے میں کہنے لگی ۔

" ہم مسافر ہیں اور بہت دُور دراز کا سفر طے کر کے آئے ہیں ـــ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا ہے اور ہمیں رات بسر کرنے کے لیے جگہ چاہیے ـــ ؟"

جیسے ہی جیڈے فلاور نے اپنا جملہ پورا کیا تو شی تن بڑھیا کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے التجا کے انداز میں بولا ۔

" ہم پہ مہربانی کرو اور ہمیں اپنے ہاں رات بسر کرنے کی اجازت دے دو ـــ ؟"

" اندر آجاؤ بچو !"

بڑھیا نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ اور جب وہ دونوں اس کے ساتھ جھونپڑی میں چلے گئے تو کہنے لگی ۔

" میں یہاں اکیلی رہتی ہوں ـــ میرا خیال ہے تم بُرا نہیں مانو گے اگر میں مشرقی سمت والے کمرے میں سو جاؤں ـــ تم مغربی سمت والے کمرے میں رات بسر کر لو !"

" جیسی تمھاری مرضی ـــ ہم تمھارے بہت ممنون ہیں !"

شی تن اور جیڈے فلاور انتہائی خوش تھے کہ بڑھیا نے انھیں رات بسر کرنے کی اجازت دے دی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ وہ ان کے ساتھ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئی تھی ۔ اس نے اسی وقت ان کے لیے چاول پکائے، سوپ تیار کیا اور خوب خاطر تواضع کی ۔ بڑھیا خوشی اور پیار سے ان کی آؤبھگت کر رہی تھی ـــ شی تن اور جیڈے فلاور کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے واقعی ان کی سگی اور مہربان ماں ان کے سامنے ہو ۔ وہ چند ہی لمحوں میں اس سے اس طرح گھل مل گئے جیسے کبھی اجنبی تھے ہی نہیں ۔ انھوں نے بڑھیا کو اوّل سے آخر تک اپنے تمام حالات بتا دیے کہ کس طرح وہ سوتیلی ماں کے ظلم سے تنگ آکر گھر سے بھاگے اور راستے میں سفر کے دوران انھیں کن کن حالات و واقعات سے دوچار ہونا پڑا ۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اسے یہ بھی بتایا کہ جب وہ سُرخ چشمے پر پہنچے تو ان کے

ساتھ کیا ہی ۔۔۔! بڑھیا یہ سب کچھ سن رہی تھی ۔ وہ اس سے پہلے بھی کسی سے سُرخ چشمے کی کہانی سن چکی تھی یہی وجہ تھی کہ جوں ہی انھوں نے چشمے کے بارے میں بتایا، اس کے ساتھ ہی بڑھیا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ۔

"میرے بچو!"

وہ بڑی اداسی اور دکھ کے ساتھ بولی ۔ ابھی تک اس کی آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے ۔ اس نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے کہا ۔

"مجھے ڈر ہے، اب تم دونوں زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ نہ رہ سکو گے ۔۔۔ تم میں جدائی یقینی ہے!"

جیاڑے فلا اور شی تن بڑھیا کی یہ بات سن کر گھبرا سے گئے ۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سُرخ چشمے کی وجہ سے ان کی جدائی کیسے ہو جائے گی ۔۔۔؟ ان دونوں میں کیا تعلق ہے اور اس میں کیا راز پوشیدہ ہے ۔۔۔؟ دونوں نے تعجب سے بڑھیا کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگے ۔

"ماں! ہمیں بتاؤ تم نے یہ کیسے جان لیا کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے ۔"

"میرے بچو! تم نے جو سُرخ چشمہ دیکھا ہے، اس کا پانی ایک سُرخ پہاڑ سے آتا ہے اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک بہت بڑا صنوبر کا درخت ہے ۔۔۔ اس درخت کی جڑوں میں سے سَت رس رس کر نیچے آتا ہے جو نیچے آکر سُرخ چشمے کا پانی بن جاتا ہے ۔"

اتنی بات کہہ کر بڑھیا رک گئی ۔۔۔ اس نے اپنے آنسو خشک کیے اور پھر کہنے لگی ۔

"ہر سال جب صنوبر کے پتے سُرخ ہو جاتے ہیں تو یہ درخت ایک سُرخ چہرے والے شیطان میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ اس شیطان کی آنکھیں اس قدر چمکیلی اور شعلہ بار ہوتی ہیں کہ ہزاروں چٹانوں اور اس بڑے پہاڑوں کی اوٹ میں ہونے کے باوجود صاف دکھائی دیتی ہیں ۔ یہ سُرخ چہرے والا شیطان سُرخ پہاڑ کی چوٹی پہ پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے ان لڑکیوں کو دیکھتا رہتا ہے جو سُرخ چشمے کا پانی پیتی ہیں ۔ پھر وہ ان لڑکیوں میں سے سب سے خوب صورت اور اپنی پسند کی لڑکی کو اٹھا لیتا ہے ۔ وہ اسے چھین کر دوسری لڑکیوں سے دُور لے جاتا

ہے اور اپنی بیوی بنا لیتا ہے۔"

بڑھیا ایک بار پھر بات کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر گئی۔ اس نے لمحہ بھر سوچا اور پھر بولی۔

"اس کے بعد جب موسم بدلتا ہے، برف باری ہونے لگتی ہے تو سُرخ چہرے والے شیطان کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی کی بھی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں صنوبر کے درخت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔"

اتنی بات کہہ کر اس نے ایک نظر جیڈرے فلاور کی طرف دیکھا اور افسوس کے لہجے میں کہنے لگی۔

"میری بچی! مجھے ڈر ہے کہ تم اس سے بچ نہ سکو گی!"

بڑھیا اتنا کہنے کے بعد خاموش ہو گئی اور پھر سے اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جیڈرے فلاور اس کی باتیں سن کر سہم سی گئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ شی تن سے اس کی جدائی ہو جائے گی۔ اسے فکر سی لاحق ہو گئی مگر پھر یہ دیکھ کر کہ بڑھیا بے چاری محض ان کی وجہ سے اس قدر اُداس اور غمگین ہو رہی ہے اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"پیاری ماں! تم گھبراؤ نہیں ــــ سُرخ چہرے والا شیطان مجھے اُٹھا کر نہیں لے جا سکتا!"

"پیاری ماں!"

شی تن بھی اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو ــــ اس کی پروا نہیں کہ وہ شیطان کس قدر خطرناک ہے۔ پھر بھی وہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا۔"

دونوں کے تسلی دینے سے بڑھیا کی ڈھارس بندھی ــــ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔

"تم دونوں بہت اچھے بچے ہو!"

اس نے کہنا شروع کیا۔

"جب سے میرا شوہر مرا ہے، اس وقت سے میں یہاں اکیلی رہ رہی ہوں۔ اب تم دونوں کے آنے سے میرے گھر میں پھر سے رونق ہو گئی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں اب میرے پاس ہی رہو۔ ہم تینوں ایک خاندان کی طرح اکٹھے زندگی بسر کریں گے۔"

جیڈے فلاور اور شی تن تو پہلے ہی کسی ٹھکانے کی تلاش میں تھے۔ جب بڑھیا نے ان سے وہاں رہنے کے لیے کہا تو وہ دونوں بہت خوش ہوئے۔ جیڈے فلاور تو خوشی سے دیوانی سی ہو کر اس سے لپٹ گئی۔

"ماں! تم کتنی اچھی ہو!"

شی تن بھی کہنے لگا۔

"ماں ——! اب ہم تمھارے ساتھ ہی رہیں گے۔ تم بوڑھی ہو گئی ہو۔ تمھارا سارا کام ہم کیا کریں گے —— تمھیں اب آرام کی ضرورت ہے۔"

چنانچہ جیڈے فلاور اور شی تن اسی بڑھیا کے ساتھ رہنے لگے۔ وہ بھی بڑھاپے کی وجہ سے زندگی سے تھک چکی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹائے اس لیے وہ خوش تھی۔ جیڈے فلاور اور شی تن کا ساتھ اس کے لیے بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ دونوں بھی اس کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ جیڈے فلاور نے گھر کا تمام کام خود سنبھال لیا تھا۔ اب بڑھیا کو نہ کپڑے سینے کی فکر تھی اور نہ ہنڈیا روٹی کا غم۔ اسے ان تمام الجھیڑوں سے نجات مل گئی تھی۔ دوسری طرف شی تن نے بڑھیا کی مختصر کھیتی باڑی کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ زمین کو گاہنا، بیج بونا اور فصلوں کی کٹائی اٹھائی اب شی تن کے سپرد تھی۔ اس طرح ان دونوں نے مل کر بڑھیا کو جیسے نئی زندگی دے دی تھی۔ وہ اس کے کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے اور رہنے سہنے کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ آرام حاصل ہو۔ جیڈے فلاور بڑھیا کے لیے ہر روز اچھے سے اچھے اور لذیذ سے لذیذ کھانے تیار کرتی۔ یہ سکھ اور یہ آرام دیکھ کر بڑھیا اپنے سارے پچھلے غم بھول گئی تھی۔ دوسری طرف اس کے ماتا بھرے پیار نے ان دونوں کو اپنے ماں باپ کی یاد بھلا دی تھی —— اس طرح اب وہ تینوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ موسم بدلتا گیا فصل اُگی، بڑھی اور پک گئی۔ پھر گندم کی پکی ہوئی فصل بھی کٹ گئی ۔ باجرے کی فصل بھی تیار ہوگئی اور انگوروں کی بیلوں پہ لدے ہوئے انگوروں کے گچھے بھی رس گئے ۔ اس کے ساتھ ہی صنوبر کے درخت کے پتّے بھی سُرخ ہوگئے بڑھیا نے جب دیکھا کہ صنوبر کے پتّے سُرخ ہوگئے ہیں تو وہ بہت گھبرائی۔ اسے یقین تھا کہ اب سُرخ چہرے والا شیطان جیڈرے فلاور کو نہیں چھوڑے گا۔ وہ دن رات اسی فکر اور اسی غم میں گھُلی جا رہی تھی۔ اس سے نہ کچھ کھایا پیا جاتا تھا اور نہ وہ سو سکتی تھی۔ ہر روز اپنی انگلیوں پہ دنوں کا حساب کرتی، اس اُمید کے ساتھ کہ موسم خزاں جلد سے جلد بیت جائے۔ وہ جانتی تھی کہ دن اور رات کا چکر تیز سے تیز تر ہو جائے گا اور وقت آگے بڑھ جائے گا۔

موسم خزاں کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں ـــــ ایک شام جب کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ چاند نے لے لی تھی۔ شی تن ابھی ابھی کھیتوں سے واپس آیا تھا اور جیڈرے فلاور بھی کھیتوں کے کام سے فارغ ہو کر گھر آئی تھی۔ وہ دونوں گھوڑوں کے لیے چارہ اور گھاس کاٹ کر لائے تھے اور اب گھوڑوں کے آگے ڈال رہے تھے۔ اس وقت بڑھیا اپنے صحن میں سے گزر رہی تھی کہ اس نے دیکھا، صنوبر کے درخت کا ایک بہت بڑا سُرخ پتّا اُڑتا اُڑتا آسمان سے نیچے آیا اور صحن میں آکر چکریاں کھانے لگا۔ یہ سُرخ پتّا تھوڑی دیر تک مسلسل فضا میں چکریاں کھاتا رہا اور پھر ایک تیز بگولے کی شکل اختیار کر گیا جو صحن میں گھومنے لگا۔ بڑھیا نے دیکھا کہ اس تیز بگولے کے درمیان سُرخ چہرے والا شیطان کھڑا تھا۔ اس کے سر پہ لمبے لمبے سُرخ بال تھے اور داڑھی بھی سُرخ تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سُرخی تھی اور اس نے لمبی آستینوں والا ایک سُرخ جُبّہ پہن رکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی آستینوں کو ایک زور کا جھٹکا دیا اور اس کے ساتھ ہی صنوبر کے درخت کا پتّا ایک خوب صورت اور نقش و نگار والی پالکی میں تبدیل ہوگیا۔ اس پالکی میں پہیے لگے ہوئے تھے اور ایسی سجی سنوری دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی دُلہن کے لیے تیار کی گئی ہو۔

بڑھیا نے یہ منظر دیکھا تو اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس نے خوف کے

مارے دہشت زدہ ہو کر زور کی چیخ ماری اور زمین پر گر پڑی۔ اس وقت شی تن اور جیڈے فلاور اصطبل میں تھے۔ جوں ہی انھوں نے بڑھیا کی چیخ سُنی وہ سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ اس کی طرف بھاگے۔ ادھر جیسے ہی سُرخ چہرے والے شیطان نے جیڈے فلاور کو دیکھا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اسے دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی ہو۔ اس نے اپنے جُبّے کی لمبی آستینوں کو ایک جھٹکا دے کر ہلایا۔ اور اس کے ساتھ ہی جیڈے فلاور اس خوب صورت پالکی میں بیٹھی ہوئی تھی جو ابھی ابھی بگولے میں سے نمودار ہوئی تھی۔ سُرخ چہرہ شیطان نے فوراً ہی دوسری بار اپنی لمبی آستینوں کو ہلایا اور دیکھتے ہی دیکھتے پالکی کے پہیے چلنے لگے۔ اس کے بعد پالکی آسمان کی طرف اُٹھنے لگی —— اور پھر — پلک جھپکتے میں وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ہر چیز غائب تھی —— نہ وہ خوب صورت پالکی تھی، نہ سُرخ چہرہ شیطان تھا اور نہ جیڈے فلاور تھی۔ صرف بڑھیا اور شی تن رہ گئے تھے جو حیران و پریشان کھڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے —— پھر اس وقت انھیں بہت دُور سے شیطان کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا۔

"اس نے میرے سُرخ چشمے کا پانی پیا ہے —— اب یہ میری ہے!"

یہ سنتے ہی بڑھیا نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ گو اس وقت شی تن بھی بہت غم زدہ اور پریشان تھا لیکن اس نے رونے پیٹنے کی بجائے حوصلے اور ہمت سے کام لیا۔ وہ آگے بڑھا اور روتی پیٹتی بڑھیا کو تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"ماں —! تم گھبراؤ نہیں —— جیڈے فلاور ضرور واپس آئے گی!"

پھر وہ جیسے کچھ سوچنے لگا —— اس نے بڑھیا کو خاموش رہنے کی تلقین کی اور بولا

"ماں! مجھے جیڈے فلاور کے پیچھے ضرور جانا چاہیے —— میں اسے ہر قیمت پہ واپس لاؤں گا، خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

شی تن کی یہ بات سن کر بڑھیا چند لمحوں کے لیے جیڈے فلاور کو بھول کر اس کے بارے میں فکر مند ہو گئی۔ اس نے سوچا جیڈے فلاور تو چلی گئی ہے۔ اس کا واپس آنا ممکن نہیں ہے اور اب یہ بھی ناحق اپنی جان گنوا دے گا۔ برسوں کی تنہائی کے بعد تو اسے ایک

سہارا ملا تھا اور وہ بھی جا رہا تھا۔ یہی کچھ سوچ کر وہ شی تن سے کہنے لگی۔

"بیٹے! تمھیں اس کے پیچھے ہرگز نہیں جانا چاہیے"۔

"نہیں ماں! — میں ضرور جاؤں گا اور جیڈے فلاور کو تلاش کر کے لاؤں گا"۔

شی تن کے اس جواب پر بڑھیا اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"سُرخ چہرے والا یہ شیطان اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں کو اسی طرح لے جا چکا ہے ان بدنصیب لڑکیوں کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ آج تک کوئی شخص کسی لڑکی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اس کے پیچھے نہیں گیا — اگر تم گئے تو تمھاری موت بے مقصد ہوگی — اس شیطان کا پیچھا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں"۔

شی تن نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا — وہ سہارا دے کر بڑھیا کو گھر کے اندر لے آیا اور پھر اس سے کہنے لگا۔

"ماں! تم اس بارے میں گھبراؤ نہیں — مجھے اسی وقت جیڈے فلاور کے پیچھے جانا چاہیے اور ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا چاہیے"۔

بڑھیا نے اسے بہت سمجھایا بجھایا کہ کسی طرح وہ اپنے اس ارادے سے باز آجائے مگر شی تن نہ مانا۔ جب بڑھیا نے جان لیا کہ وہ ضرور جائے گا تو اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگی

"میرے بیٹے! اگر تم اب جا ہی رہے ہو تو تمھیں اس خطرناک مہم پر خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے —!"

اتنا کہہ کر اس نے ایک خنجر نکالا اور اسے دے کر بولی۔

"تم جا رہے ہو تو یہ خنجر اپنے ساتھ لے جاؤ — یہ مصیبت میں تمھارے کام آئے گا"۔

شی تن نے بڑھیا سے خنجر لیا، اصطبل میں جا کر ایک تیز رفتار گھوڑے کو تیار کیا اور خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے بڑے پہاڑ کی جانب چل دیا۔

اس وقت شی تن غم زدہ بھی تھا اور پریشان بھی۔ وہ جلد سے جلد جیڈے فلاور کو تلاش کر لینا چاہتا تھا۔ اس گھبراہٹ اور پریشانی میں وہ اس قدر بے صبرا ہوا جا رہا تھا کہ اسے

برق رفتاری سے دوڑتا ہوا گھوڑا یوں لگ رہا تھا جیسے بہت آہستہ چل رہا ہو۔ وہ اسے اور تیز دوڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ پہاڑوں کے درمیان ایک خالی میدانی جگہ پہ پہنچا تو بہت ہی بے صبرا ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے گھوڑے ــــ چھلانگ لگا اور پہاڑوں کے درمیان آنے والی اس خالی جگہ کے اوپر سے گزر جا ــــ!"

اس کا اتنا کہنا تھا کہ گھوڑے نے بڑی پھرتی اور تیز رفتاری سے ایک لمبی چھلانگ لگائی شی تن نے دیکھا کہ اس ایک ہی چھلانگ سے گھوڑا پہاڑوں کے درمیان آنے والی بہت بڑی وادی کو عبور کر گیا۔ اب وہ ایک ایسی جگہ پہ پہنچ چکا تھا جہاں پہاڑوں کی دو ڈھلوان سطح آپس میں مل رہی تھیں۔ یہ جگہ بڑی خطرناک تھی اور اسے پار کرنا گھوڑے کے لیے بہت مشکل تھا۔ یہ دیکھ کر شی تن نے ایک بار پھر گھوڑے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے گھوڑے ــــ! اس جگہ کو بھی چھلانگ لگا کر پار کر جا ــــ!"

اس نے اتنا کہا اور اس کے ساتھ ہی گھوڑا ایک بہت بڑی جست لگا کر اس جگہ پر سے پھلانگ گیا۔ اسی طرح شی تن اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا مسلسل سفر کرتا رہا ــــ یہاں تک کہ شام ہو گئی ــــ شام گزری تو رات نے اپنی سیاہ چادر ہر طرف پھیلا دی مگر شی تن کہیں دم بھر کے لیے نہ رکا ــــ وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ اسے صحیح طور پہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا سفر ابھی کتنا باقی ہے اور وہ کب تک وہاں پہنچ پائے گا ــــ بس وہ تو چلا جا رہا تھا۔ اسے ایک ہی دھن سوار تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے جیڈے فلاور کو سرخ چہرہ شیطان سے نجات دلائے۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد جب صبح ہوئی اور چاروں جانب روشنی پھیلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے پہاڑ پر پایا۔ وہ وہاں ٹھہر گیا ــــ یہ پہاڑ بہت بڑا تھا اور اس پہ بے شمار درخت نظر آ رہے تھے جن میں جگہ جگہ پتھروں کے درمیان خالی جگہیں تھیں جو بہت گہرائی تک چلی گئی تھیں۔ اس نے کھڑے کھڑے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن اسے کوئی دکھائی نہ دیا ــــ وہ مایوس ہو گیا اور اسی مایوسی کے عالم میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

شی تن تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا سوچتا رہا اور پھر اس خیال سے پہاڑ کی چوٹی کی طرف

ڈھنے لگا کہ شاید اسے سرخ چہرہ شیطان اور جیڈے فلاور کا اتا پتا مل جائے ۔ ہولے ہولے پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ چوٹی پر پہنچ گیا ۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے بڑی اداس نظروں سے اس پورے علاقے کا جائزہ لیا ۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح جائزہ لیتا رہا اور سوچتا رہا ـــــ پھر اس نے اپنی پلکوں سے آنسو پونچھے اور گھوڑے سے کہنے لگا ۔

"اے گھوڑے ! مجھے جیڈے فلاور کو ضرور تلاش کرنا ہے ، خواہ اس کے لیے مجھے دُنیا کے تمام پہاڑوں پر بھی کیوں نہ جانا پڑے"

اتنا کہہ کر اس نے باگیں سنبھالیں اور بولا

"اب تم سب سے بڑے اور اونچے پہاڑ پر چلو ـــــ وہ پہاڑ چاہے یہاں سے کتنے ہی فاصلے پر واقع ہو ، مجھے اس پر ضرور جانا ہے ۔"

جوں ہی اس نے یہ کہا ، گھوڑے نے بڑی پھرتی اور تیزی سے چھلانگ لگائی اور ہوا سے باتیں کرنے لگا ۔ وہاں راستہ اس قدر دشوار گزار اور خطرناک تھا کہ کسی عام آدمی کا چلنا تو کجا وہاں جانا تک ممکن نہ تھا ۔ مگر شی تن کا گھوڑا بلا کا تیز رفتار تھا ۔ وہ کھائیوں ، گھاٹیوں ، ڈھلانوں اور اونچائیوں کو پھلانگتا ہوا مسلسل دوڑا چلا جا رہا تھا ۔ کہیں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی ہزاروں فٹ اونچی چٹانیں آتی تھیں اور گہرے ہزاروں فٹ گہرے درے آتے لیکن گھوڑا ان تمام دشواریوں کو عبور کرتا جا رہا تھا ۔ خطرناک سے خطرناک مقامات سے یوں گزر جاتا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔ ادھر شی تن کو بار بار یوں احساس ہو رہا تھا جیسے وہ موت کے منہ میں گیا کہ گیا ۔ بعض جگہوں پر تو وہ گھوڑے کی پشت سے گرتے گرتے بچا مگر پھر بھی اس نے گھوڑے کی باگیں نہ کھینچیں وہ جس طرح دوڑ رہا تھا دوڑنے دیا اور جس طرف جا رہا تھا جانے دیا ۔ ایک پہاڑ کے بعد دوسرا پہاڑ آتا اور دوسرے کے بعد تیسرے کا سامنا ہوتا تھا ۔ ایک سے ایک بلند اور ایک سے ایک خطرناک پہاڑ تھے ۔ اس پر بھی وہ ابھی تک سب سے بڑے پہاڑ پر نہ پہنچ پایا تھا ـــــ اس کا سفر جاری تھا اور وہ جیڈے فلاور کو تلاش کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا ۔

سب سے بڑے پہاڑ کی چوٹی سے بہت نیچے ایک بڑا سا غار تھا اور اسی غار میں سرخ چہرے والے شیطان نے جیڈے فلاور کو چھپا رکھا تھا ۔ اس نے اس غار کو بڑی خوب صورتی

سے سجایا ہوا تھا۔ اس میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کی دیواروں پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے، جگہ جگہ دل کش تصویریں لٹک رہی تھیں اور چھت پر بھی بڑا نفیس کام کیا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی بہت بڑے دولت مند کا گھر ہو جس میں تن آسانی کی ہر شے موجود تھی۔ ایک طرف سہری پڑی ہوئی تھی جس پر ریشم کے رنگین اور آرام دہ گدے پڑے ہوئے تھے۔ اس پر ریشم ہی کی نہایت نفیس اور دیدہ زیب چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ اس وقت سُرخ چہرہ شیطان نے کایا پلٹ کر کے اپنے آپ کو انسانی روپ میں تبدیل کر رکھا تھا۔ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی دانش ور یا فلاسفر ہو۔ وہ ایک خوب صورت اور صحت مند انسان کے روپ میں تھا اور بہت خوش تھا۔ اس کے برعکس جیڈے فلاور کے چہرے پر اداسی اور غم کی جھلک تھی۔ وہ بجھی بجھی اور مرجھائی مرجھائی سی تھی۔ اس نے مسکرا کے جیڈے فلاور کی طرف دیکھا اور بولا

"جب سے تم نے میرے سُرخ چشمے کا پانی پیا ہے اس وقت سے تم میری بیوی بن چکی ہو!"

اتنی بات کہہ کر وہ اس طرح مسکرایا جیسے اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا ہو۔ جواب میں جیڈے فلاور خاموش رہی۔ اس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور سر جھکائے اداس بیٹھی تھی۔ یہ دیکھ کر شیطان بڑے غرور سے بولا۔

"اپنے شوہر کو بھول جاؤ —— وہ اب یہاں کبھی نہ آسکے گا —— اگر اس کے تین سر اور چھ بازو ہو جائیں تو جب بھی یہاں تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔"

جوں ہی جیڈے فلاور نے شیطان کی آواز سُنی وہ غصّے میں کانپنے لگی۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس غار میں اس قدر سناٹا تھا کہ وہ آندھی کی سائیں سائیں اور پرندوں کی چہکار بھی نہیں سُن سکتی تھی۔ تاہم اسے اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ شی تن ضرور اسے تلاش کر رہا ہوگا، وہ کسی نہ کسی طرح اس بلند پہاڑ تک ضرور پہنچ جائے گا۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ اس کی جدائی سے پریشان اور اداس ہوگا۔ وہ اس کے غم میں آنسو بہا رہا ہوگا یہی کچھ سوچتے ہوئے اس نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اُٹھایا اور کہا۔

"یہ ٹھیک ہے، میں نے تمھارے چشمے کا پانی پیا ہے —— مگر اتنی بات یاد رکھو کہ میں تمھاری بیوی کبھی نہ بنوں گی۔ تمھارا یہ خواب کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔"

اس پر سُرخ چہرہ شیطان دانت پیستے ہوئے بولا۔

"اچھا ___ میں سمجھا ___ تمھیں ابھی تک اس بات کا یقین ہے کہ تمھارا شوہر تم تک پہنچ جائے گا اور تم اسے دوبارہ دیکھ سکوگی ___ ! یہ تمھیں غلط فہمی ہے !"

پھر وہ شیخی بگھارنے کے انداز میں کہنے لگا۔

"میں ڈینگ نہیں مارتا ___ لیکن چلو اتنی بات کہتا ہوں کہ اگر تمھارا شوہر اس سُرخ پہاڑ تک آجائے تو میں تمھیں اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دوں گا"!

اتنا کہنے کے ساتھ ہی وہ بڑے غرور اور بدنیتی سے مسکرانے لگا ___ شاید ابھی وہ کچھ اور کہتا کہ اتنے میں اس نے غار سے باہر نظریں دوڑائیں اور ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ اس نے دیکھا، شی تن گھوڑے پر سوار پہاڑیوں، چٹانوں اور گھاٹیوں پر سے ہوتا ہوا اس بڑے پہاڑ کی طرف آرہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو شیطان کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ وہ حیران و پریشان آتے ہوئے شی تن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ شی تن بڑی برق رفتاری سے اس کی جانب آرہا تھا سُرخ چہرہ شیطان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بڑی پھرتی سے اپنی کایا پلٹ کرلی۔ وہ انسانی روپ سے تبدیل ہو کر پھر اپنے اصلی روپ میں آگیا۔ پھر اس نے جلدی سے اپنی کمر سے بندھی ہوئی نیلے نشانات والی پیٹی اُتاری اور اسے جھٹک کر فضا میں پھینک دیا۔ جوں ہی اس نے پیٹی کو پھینکا وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑے خوں خوار شیر میں تبدیل ہوگئی جو دھاڑتا ہوا چھلانگ لگا کر غار سے باہر نکل گیا۔

اس دوران میں شی تن نے پانچ اور بڑے پہاڑ عبور کر لیے تھے اور اب وہ طوفانی رفتار سے آگے بڑھتا آرہا تھا۔ اس وقت اس پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ جلد سے جلد سب سے بڑے پہاڑ پر پہنچ جائے۔ وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز تھا اور برق رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اچانک اسے اپنے راستے میں دُور دو چراغ سے جلتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ اس خوں خوار شیر کی آنکھیں تھیں جو شیطان کی پیٹی سے بنا تھا اور جس کی آنکھوں کی چمک دو ستاروں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ یہ شیر شی تن کے راستے میں منہ پھاڑے کھڑا اس کا منتظر تھا۔ ادھر شی تن کا گھوڑا اس قدر تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا کہ وہ شیر کو نہ دیکھ سکا۔ نہ ہی شی تن نے اس کا

اندازہ کیا تھا۔ چنانچہ جوں ہی وہ شیر کے قریب پہنچا اپنے گھوڑے سمیت شیر کے بہت بڑے اور بے تحاشا کھلے ہوئے منہ کے اندر چلا گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی کڑھاؤ میں کھولتے ہوئے پانی میں گر پڑا ہو۔ تاہم اس موقع پر بھی اس نے اپنے ہوش و حواس بجا رکھے۔ اس نے شیر کے دانتوں کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے اپنا خنجر نکال کر اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ پیٹ کا چاک ہونا تھا کہ شیر درد و کرب سے دھاڑا اور اس کے ساتھ ہی شی تن اور اس کا گھوڑا، دونوں باہر زمین پہ آگرے۔ وہ جلدی سے اٹھا کہ کہیں مرتا ہوا شیر پھر اس پہ حملہ نہ کر دے مگر دیکھا تو وہاں شیر کا دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ وہ غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ زمین پہ سیاہ نشانات والی ایک مٹی پڑی تھی۔

شی تن نے تھوڑی دیر تک وہاں کھڑے کھڑے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر سستایا، اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر سے اپنے گھوڑے کو تیار کر کے سفر پہ روانہ ہو گیا۔ اس نے دو اور بڑے پہاڑوں کو عبور کیا اور اب وہ اپنی منزل کے قریب تھا۔ سب سے بڑا پہاڑ اس کے سامنے تھا اور اب جیڈے فلاور تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہ تھی۔

دوسری طرف سرخ چہرے والا شیطان دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ شی تن کی موت یقینی ہے۔ اس کا زندہ رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اس لیے وہ جیڈے فلاور کے سامنے شیخیاں بگھار رہا تھا۔

"تمھارا شوہر زندہ نہیں بچ سکتا!"

"اس کا خیال دل سے نکال دو!"

"وہ تو اب تک موت کے منہ میں جا بھی چکا ہو گا!"

یوں وہ طرح طرح سے جیڈے فلاور کو ڈرا اور ستا رہا تھا۔ بے چاری جیڈے فلاور اس کو کیا جواب دے سکتی تھی ــــ؟ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور جواب میں صرف آنسو بہا رہی تھی۔ شیطان نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے رہی تو وہ اور بھی بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور ابھی اس کو اپنی گرفت میں لینے ہی لگا تھا کہ یکایک پریشان ہو کر رک گیا۔ اس کے

قدم جہاں تھے وہیں جم گئے اور آگے کو اُٹھے ہوئے دونوں ہاتھ فضا میں معلق ہو کر رہ گئے۔
اس کے چہرے پر تعجب اور گھبراہٹ کے آثار تھے۔ وہ غار میں بنے ہوئے ایک بڑے چھید میں سے شی تن کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے دیوار کے ساتھ تصویروں کا ایک لٹکتا ہوا گولا سا اُتارا، اس کے بعد اپنے جبّے کی آستینوں کو زور سے جھٹکا دیا۔
اور تصویروں کا وہ گولا ڈھلوان اور پھسلنے والے پہاڑ سے نیچے لڑھکا دیا۔
دوسری طرف اس دوران میں شی تن ایک اور پہاڑی کو عبور کر چکا تھا اور اب سیدھے ڈھلوان پہاڑ پر پہنچ کر مقابلے میں آنے والا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کے گھوڑے نے چھلانگ لگا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ پھسل کر پھر واپس آ گیا۔ یہ پہاڑ ڈھلوان تھا اور گھوڑے کا پاؤں جمنا مشکل تھا۔ یہ دیکھ کر شی تن گھوڑے سے نیچے اُتر آیا اور خود آگے بڑھ کر پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بڑی جدوجہد سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ آدھے راستے تک ہی اوپر گیا تھا کہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ پھسل کر پھر وہیں واپس آ گیا جہاں سے اس نے چڑھنا شروع کیا تھا۔ اس اُترنے چڑھنے میں اس کا جسم جگہ جگہ سے زخمی ہو گیا تھا، چہرے پر پتھروں سے خراشیں آ گئی تھیں اور ہاتھ پاؤں چھل گئے تھے۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں سے خراشوں کی وجہ سے خون رِس رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے حوصلہ نہ ہارا —— اس نے ایک بار پھر اپنی ساری قوت جمع کی اور دوبارہ پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس بار بھی ناکام ہوا تو از سرِ نو ہمت کی۔ اس طرح وہ بار بار اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ تمام کپڑے پسینے میں اس طرح بھیگ گئے تھے کہ ان میں سے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کا چہرہ بھی پسینے میں تر بتر تھا اور قطرے ٹپک ٹپک کر آنکھوں میں آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر سے پسینہ صاف کیا اور پھر سے ڈھلوان اور پھسلن والے پہاڑ پر چڑھنے کا ارادہ کیا —— لیکن اچانک وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جس پہاڑ پر وہ چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا وہ غائب تھا۔ اس کی بجائے اس نے اپنے آپ کو پہاڑوں کے درمیان ایک خالی وادی میں کھڑا پایا۔ اس کے پاس ہی ایک سوکھا درخت تھا جس پر ایک کاغذ لٹک رہا تھا۔ اس

کاغذ پر اسی پہاڑ کی تصویر کھنچی ہوئی تھی جو ابھی ابھی اس کی نظروں سے غائب ہوا تھا۔ کاغذ اس کے پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور شی تن یہ سب کچھ دیکھ کر حیران تھا مگر وہ جانتا تھا کہ سُرخ چہرہ شیطان اپنا ہر حربہ استعمال کر رہا ہے۔ وہ شی تن کو شکست دینے کے لیے ہر کوشش آزما رہا ہے ـــ لیکن شی تن بھی ہار ماننے والا نہیں تھا ـــ اس نے اس بات کا تہیّہ کر رکھا تھا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے وہ اپنی جیڈ ے فلاور کو ضرور حاصل کرے گا۔

شی تن چند لمحوں تک وہیں کھڑا سوچتا رہا اور اس کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر پھر سے چل دیا۔ دشوار گزار راستوں سے گزرتا ہوا اور طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہوتا ہوا آخر کار وہ سب سے بڑے پہاڑ کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ پہاڑ اتنا بڑا تھا کہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور اس کا رنگ سُرخ تھا۔

"یقیناً یہی وہ سُرخ پہاڑ ہے جس پر سُرخ چہرے والا شیطان رہتا ہے۔"

اس نے اپنے دل میں سوچا ـــ اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا پوری قوت صرف کر کے پہاڑ پر چڑھنے لگا۔

دوسری طرف سُرخ چہرہ شیطان اپنے غار میں بیٹھا کوئی نئی ترکیب سوچ رہا تھا کہ شی تن کو شکست دے سکے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے اپنے جبّے کی دونوں آستینیں جیڈ ے فلاور پر پھیلا دیں۔ آستینوں کا پھیلانا تھا کہ اس کے ساتھ ہی جیڈ ے فلاور مبہوت ہو کر ساکت ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے تکیے کے دو غلاف لے کر ان پر اپنی آستینیں جھٹکیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں غلاف جیڈ ے فلاور کی شکل اختیار کر گئے ـــ چنانچہ اب وہاں ایک کی بجائے تین جیڈ ے فلاور تھیں اور تینوں کی تینوں بے حس و ساکت تھیں ـــ شیطان نے اپنے جادو کے زور سے انھیں پتھر بنا دیا تھا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد شیطان خود وہاں سے غائب ہو گیا۔

شی تن بدستور ابھی تک پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ پہاڑ کی آدھی چڑھائی تک ہی پہنچا تھا کہ اس نے دیکھا، وہاں کی ہر چیز سُرخ رنگ کی تھی۔ صنوبر کے درخت کے پتّے سُرخ تھے، پتھر سُرخ رنگ کے تھے، وہ جس طرف نظر اٹھاتا اسے ہر چیز سُرخ دکھائی دیتی۔ اس نے

اِدھر اُدھر تلاش کیا تو اسے وہاں ایک غار دکھائی دیا۔ اس غار کا دروازہ بڑا خوب صورت تھا اور اس پر بیش قیمت ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ شی تن نے اپنا گھوڑا روک لیا

"شاید اسی غار میں سُرخ چہرے والا شیطان رہتا ہو —— ؟"

اس نے ہولے سے اپنے آپ سے کہا اور گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔ پھر اس نے گھوڑا ایک جانب کھڑا کر دیا اور خود غار کے پاس چلا گیا۔ جب اس نے غار کا دروازہ قریب جا کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اس پر جو نایاب قسم کے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے ان کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسے ایسے رنگین اور خوب صورت پتھر تھے کہ اس نے آج تک نہ دیکھے تھے۔

"یقیناً یہی وہ غار ہے —— جیڈے فلاور کو یہیں ہونا چاہیے —— !"

اس کے دل نے گواہی دی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے سامنے رکھے ہوئے بڑے سے پتھر کو ایک طرف ہٹایا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا —— جوں ہی اس نے غار کے اندر قدم رکھا، وہ حیران اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے —— اس کے سامنے ایک کی بجائے تین جیڈے فلاور کھڑی تھیں —— بالکل ایک سا قد، ایک سا انداز، ایک سے خدوخال اور ایک ہی سا لباس۔ تینوں ہو بہو ایک سی تھیں —— وہی پتلی پتلی کمان سی بھویں اور وہی بڑی بڑی آنکھیں جو اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ تینوں پتھر کی طرح ساکت کھڑی تھیں۔

"عجیب بات ہے —— !"

اس نے حیران ہو کر جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"ان میں اصلی جیڈے فلاور کون سی ہے —— ؟"

شی تن بڑے تعجب سے تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے باری باری ہر ایک کا بغور جائزہ لیا مگر وہ اصلی جیڈے فلاور کو نہ پہچان سکا۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا تو وہ تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"پیاری جیڈے فلاور —— ! تمھیں پہچاننا میرے لیے بہت مشکل ہے —— تم بات

کیوں نہیں کرتی ہو اور میرے پاس کیوں نہیں آ جاتی ہو ——؟"

جیڈے فلاور شی تن کا ہر وہ لفظ سُن رہی تھی جو وہ ادا کر رہا تھا لیکن وہ جواب کیسے دیتی ؟ اپنے دل کی کیفیت کیونکر بیان کرتی ؟ اس کے ساتھ جو بیتی تھی اسے کیسے بتاتی ——؟ سُرخ چہرے والے شیطان کے جادو کے زور سے اس کی زبان پتھر کی ہو چکی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں حرکت نہیں کر سکتے تھے پھر وہ بات کیسے کرتی ؟ خود آگے بڑھ کر کیسے آ جاتی ——؟ کہا جاتا ہے ۔ دنیا میں سب سے المناک اور دکھ کی بات یہ ہے کہ کسی سے اس کے محبوب کو جدا کر دیا جائے لیکن اس وقت جیڈے فلاور کے دل پر جو بیت رہی تھی ، وہ اس سے بھی زیادہ المناک کیفیت تھی ۔ اس کا محبوب اس کے سامنے کھڑا تھا ، وہ اُسے بُلا رہا تھا ، اس کے لیے بے تاب تھا مگر وہ اس کی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتی تھی ۔ اس سے بات نہیں کر سکتی تھی اور اس کے قریب نہیں جا سکتی تھی ۔ یہی کچھ سوچ سوچ کر اس کے دل پر آرے سے چل رہے تھے ۔ مجبوری اور بے کسی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جو پلکوں سے ڈھلک کر اس کے گالوں پہ پھیل گئے —— اتفاق کی بات دیکھیے کہ اسی مجبوری اور بے کسی نے یہ مسئلہ حل کر دیا ۔ جوں ہی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے گالوں پہ گرے شی تن فوراً سمجھ گیا کہ یہی اصلی جیڈے فلاور ہے ۔

" صرف اصلی جیڈے فلاور ہی اپنے محبوب کے لیے آنسو بہا سکتی ہے ——!"

اس نے اپنے آپ سے کہا اور آگے بڑھ کر اسی جیڈے فلاور کو اٹھا لیا جس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو جاری تھے ۔ وہ اُسے اٹھائے ہوئے غار سے باہر نکل آیا ۔ اس وقت جیڈے فلاور کا جسم ایسے بھاری تھا جیسے کوئی چٹان ہو ۔ شی تن کے لیے اسے اٹھانا مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی اسے اٹھائے ہوئے تھا ۔ اس کے لیے اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے اٹھا کر گھوڑے پر کیسے سوار ہو ——؟ پھر اسے گھوڑے پہ سوار کر کے سفر کرنا اور بھی مشکل مرحلہ تھا شی تن نے جیڈے فلاور کو زمین پہ رکھے بغیر اپنے گھوڑے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔

" اے گھوڑے ! تجھے راستہ معلوم ہے —— آ ، اور ہمیں واپس لے چل ——؟"

گھوڑے نے یہ سُنا اور ایک راستے پر چل دیا اور اس کے پیچھے پیچھے شی تن چلنے لگا ۔

اس نے کندھوں پر جیڈے فلاور کو اٹھا رکھا تھا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔ راستہ بڑا دشوار گزار اور ناہموار تھا۔ پتھروں کے ٹکڑے تھے، جھاڑیاں تھیں، گھاس پھونس تھا اس لیے وہ بڑی احتیاط اور وقت سے چل رہا تھا جیڈے فلاور کو اس قدر حفاظت سے لے جا رہا تھا کہ خود کو خراشیں بھی آتیں تو پرواہ نہ کرتا، پاؤں زخمی ہوتے تو خاطر میں نہ لاتا لیکن جیڈے فلاور کو خراش تک نہ آنے دی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی پیاری جیڈے فلاور کو ذرا سی خراش بھی آگئی تو اسے یوں محسوس ہوگا جیسے خود کو ہزاروں زخم آگئے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ بہت بچ بچ کر چل رہا تھا۔ اسی طرح جیڈے فلاور کو اٹھائے وہ گھوڑے کی رہنمائی میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں صنوبر کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ وہ چل چل کے نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کی ٹانگیں بُری طرح دُکھ رہی تھیں، بازو تھک کر شل ہو گئے تھے اور جسم کانپ رہا تھا مگر اس کے باوجود اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی جیڈے فلاور کو اپنے کندھوں سے نیچے نہیں اُتارا تھا۔ جیڈے فلاور بھی اس کی یہ حالت دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی ــــ؟ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر اس کی جگر شی تن کے دُکھ نے لے لی تھی۔ اس نے اپنے دل ہی دل میں بڑے دُکھ کے ساتھ کہا۔

"پیارے شی تن ــــ مجھے نیچے اُتار دو اور کچھ دیر کے لیے سستا لو ــــ ہمارا سفر بہت طویل ہے ــــ اگر تم نے اسی طرح مجھے مسلسل اٹھائے رکھا تو گھر تک نہ پہنچ پاؤ گے!"

یہ سب کچھ وہ اپنے دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ وہ بول سکتی نہیں تھی جو اپنے دل کی اس کیفیت کا اظہار کرتی۔ اسے بڑا دُکھ تھا کہ کاش! اس کے دل کی حالت کا شی تن کو بھی پتا چل جائے وہ یہ جان لے کہ اس مصیبت میں وہ بھی شی تن کے ساتھ شریک ہے۔ اسے اس کی تکلیف کا پورا پورا احساس ہے۔ دوسری طرف شی تن کو بھی خیال تھا، شاید جیڈے فلاور اپنے دل میں یہ سوچ رہی ہو کہ محض میری وجہ سے شی تن کو یہ مصیبت جھیلنا پڑ رہی ہے۔ شاید وہ یہ خیال کر رہی ہو کہ میں اس کی وجہ سے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ یہی کچھ سوچ کر وہ جیڈے فلاور کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"پیاری جیڈے فلاور ــــ! اگر تم پوری کی پوری بھی پتھر میں تبدیل ہو جاؤ تو میں جب بھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا"

اسی طرح شی تن، جیڈے فلاور کو کندھوں پر اٹھائے مسلسل سفر کر رہا تھا کہ اچانک صنوبر کے پتّے درخت سے جھڑ کر اس کے سامنے آ گرے ——— پتّوں کا گرنا تھا کہ سُرخ چہرے والا شیطان اس کے سامنے کھڑا تھا ——— اسے دیکھتے ہی شی تن نے جلدی سے ایک بازو سے جیڈے فلاور کو تھاما اور دوسرے ہاتھ میں خنجر سنبھال کر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا پیشتر اس کے کہ وہ آگے بڑھ کر وار کرتا، سُرخ چہرہ شیطان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے باز رہنے کے لیے کہا۔

"اے بہادر نوجوان ———!"

وہ شی تن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"میرا دل چقماق کے پتھر سے بھی زیادہ سخت تھا ——— میں نے کبھی کسی پر ترس نہیں کھایا ——— اور میں نے آج تک کسی سے شکست قبول نہیں کی۔"

وہ اتنی بات کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور پھر شی تن کو دیکھ کر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"لیکن آج ——— میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں تم سے شکست کھا گیا ہوں!"

جب وہ اتنی بات کہہ رہا تھا اس وقت اس کے لہجے میں بڑی اداسی تھی۔ اس کی آواز اور اس کے الفاظ سے مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا ——— اس نے پھر کہا۔

"میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں آئندہ کسی عورت کو اس کے ماں باپ یا شوہر سے جُدا نہیں کروں گا ——— میں ان کی خوشیاں نہیں چھینوں گا۔"

جوں ہی سُرخ چہرہ شیطان نے یہ بات کہی اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہنے لگے ——— اس نے جلدی جلدی پلکوں کو جھپکا اور اس کے ساتھ ہی وہ صنوبر کے ایک بہت بڑے درخت میں تبدیل ہو گیا جس کے سُرخ پتّوں پہ چاندی جیسی چمکیلی شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔

شی تن تھوڑی دیر تک حیرت کا مجسمہ بنا کھڑا رہا ——— پھر اس نے اپنا خنجر دوبارہ

میان میں رکھ لیا اور جیڈرے فلاور کو اٹھا کر آگے بڑھا ——— جیسے ہی وہ صنوبر کے درخت کے نیچے سے گزرنے لگا، درخت کی شاخوں میں جنبش ہوئی اور شیشے کی طرح صاف و شفاف شبنم کے چند قطرے جیڈرے فلاور پر گرے ——— قطروں کا گرنا تھا کہ فوراً ہی جیڈرے فلاور کی قوتِ گویائی اور حرکت کرنے کی طاقت واپس آگئی ——— اب وہ پھر سے اپنے صحیح انسانی روپ میں آگئی تھی۔ اس وقت شی تن اور جیڈرے فلاور کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں بار بار ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں دکھ کی بجائے مسرت کے آنسو چمک رہے تھے۔

وہ دونوں گھوڑے پر سوار اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے ——— گھوڑے نے بڑی برق رفتاری سے کئی پہاڑ اور گھاٹیاں عبور کیں ——— اور پھر ——— چھوٹے بڑے راستوں پر دوڑتا ہوا آخر کار انھیں گھر لے آیا ——— آگے بڑھیا ان کے انتظار میں غم زدہ تھی اور ان کی واپسی سے مایوس ہو چکی تھی ——— جیسے ہی اس نے شی تن اور جیڈرے فلاور کو دیکھا، دیوانہ وار ان سے لپٹ کر بلائیں لینے لگی۔

"میرے پیارے بچو ——— تم آگئے ———!"

"میں تو مایوس ہو چکی تھی ——— اللہ نے میری سن لی ———!"

جیڈرے فلاور نے اپنی داستان سنائی اور شی تن نے اپنی کہانی بیان کی ——— اور پھر وہ دونوں وہاں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے ——— اب وہ بڑھیا ہی ان کی ماں تھی اور وہ دونوں اس کے اپنے بچے تھے۔

اس دن کے بعد سے لوگوں نے دیکھا کہ وہ عجیب و غریب سرخ چشمہ پھر سے بڑے پہاڑ کے دامن میں نمودار ہو گیا ——— بہت سی عورتوں نے اس کا سرخ پانی پیا ——— اور اس کے بعد صنوبر کے درخت بھی سرخ ہوئے مگر سرخ چہرے والا شیطان پھر کبھی اس طرف نہیں آیا۔ پھر کبھی کسی عورت کو اٹھا کر نہیں لے گیا۔

سورج کا سفر

JOURNEY TO THE SUN



پرانے وقتوں کی بات ہے۔ چین کے کسی دور دراز علاقے میں دی چنگ لوگ رہتے تھے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ۔

"آسمان پہ ایک سورج ہے جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ اور زمین پہ رہنے والے تمام جان دار اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے!"

لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود اس وقت وی چنگ سورج کی روشنی سے بالکل محروم تھے۔ انھوں نے نہ کبھی سورج کو دیکھا تھا اور نہ ان کے سروں پہ کبھی دھوپ چمکی تھی۔ ان دنوں دی چنگ جہاں رہتے تھے وہاں مکمل طور پہ تاریکی چھائی رہتی تھی۔ دن ہو یا رات، دوپہر ہو یا شام، ان کے لیے سب ایک سے تھے۔ وہاں ہر وقت اندھیرا پھیلا رہتا اور ایسے لگتا جیسے ان پہ جنم جنم کے لیے سیاہ چادر تان دی گئی ہو۔ یہی نہیں بلکہ اس خوف ناک اندھیرے میں طرح طرح کی جنگلی بلائیں اور قسم قسم کے خون خوار درندے رہتے تھے۔ دھاڑتے ہوئے شیر، چنگھاڑتے ہوئے چیتے، پھنکارتے ہوئے سانپ، خطرناک بھیڑیے، زندہ نگل جانے والے اژدھا، اور اسی طرح کے دوسرے بے شمار درندے اور آدم خور جانور تھے جو وی چنگ لوگوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ وہ آئے دن لوگوں کو چیر پھاڑ کھاتے اور جسے چاہتے اپنی خوراک بنا لیتے۔ اسی طرح بے شمار لوگ موت کے منہ میں جا چکے تھے۔ وی چنگ بڑے پریشان تھے،

لیکن اندھیرے کی وجہ سے مجبور و بے بس تھے۔ اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ وہ اکثر سوچتے :-

"ہم اس اندھیرے میں ان درندوں کو کیسے ہلاک کریں۔۔؟ اس تاریکی میں ان سے کیوں کر بچا جا سکتا ہے ۔۔؟"

بڑے بوڑھوں نے آپس میں مل بیٹھ کر صلاح مشورہ کیا۔

"اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو ان درندوں کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ یہ دھیرے دھیرے ایک دن ہم سب کو ختم کر دیں گے ۔۔؟"

وہ دنوں، ہفتوں اور مہینوں تک اس بارے میں سوچ بچار کرتے رہے۔ آخر انھوں نے آپس میں طے کیا کہ :-

"چند لوگ سورج کے پاس روانہ کیے جائیں اور سورج سے کہا جائے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد کرے !"

جوں ہی انھوں نے طے کیا، وی چینگ لوگوں میں ایک نیا جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ ان کے زندہ رہنے کی ایک تدبیر نکل آئی تھی اور ان کے خیال کے مطابق اب وہ خون خوار جنگلی درندوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ تمام لوگ ایک جگہ جمع ہوئے اور وہاں ان کے بڑے بوڑھوں نے سب کو بتایا :-

"صرف سورج ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اگر ہم نے اس کی مدد نہ چاہی تو اس طرح ایک روز ہم سب موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ ہمارا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔"

پھر انھوں نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :-

"وہ چند لوگ اپنے آپ کو پیش کریں جو اس سفر کے لیے تیار ہیں ؟"

بڑے بوڑھوں کا اتنا کہنا تھا کہ ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر کہنے لگا:

"مجھے بھیجا جائے ۔۔ !"

"سورج کے سفر پر میں جاؤں گا ۔۔ !"

کوئی کہتا :۔

"میں سب سے تنومند ہوں اس لیے اس مہم پر مجھے روانہ کیا جائے ۔؟"

اس پر دوسرا کوئی بول اُٹھتا :۔

"نہیں —— میں تجھ سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہوں ۔مجھے اجازت ملنی چاہیے!"

ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ ایکا ایکی مجمع کو چیرتا ہوا ایک ساٹھ سالہ بوڑھا آگے بڑھا اور بلند آواز میں بولا :

"اس سفر پر مَیں جاؤں گا ——!"

پھر اس نے سب کے سامنے آ کر کہا :۔

"مَیں ساٹھ سال کا ہو چکا ہوں ۔مَیں نے بہت زندگی گزار لی ہے اور اب مَیں اس اندھی زمین پر کام نہیں کر سکتا ۔مَیں اب یہاں اور زندہ نہیں رہ سکتا —— اسی لیے سفر پر مَیں جاؤں گا کیونکہ ابھی تک مَیں چل سکتا ہوں اور دوڑ سکتا ہوں ——!"

اتنے میں ایک درمیانی عمر کا آدمی آگے بڑھا اور بوڑھے کو ایک طرف دھکیل کر بولا :۔

"تم اس سفر پر نہیں جا سکتے ——!"

پھر اس نے بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :۔

"مَیں تم سے کہیں زیادہ جوان اور طاقتور ہوں —— پھر یہ کہ مَیں دوڑنے میں بہت تیز رفتار ہوں ۔ایک دن میں بیسیوں میل کا سفر طے کر سکتا ہوں ۔ اس طرح مَیں سورج تک بہت جلد پہنچ جاؤں گا ——!"

اس آدمی کے اتنا کہنے کے ساتھ ہی پھر وہی پہلے کا سا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اس سے کہیں زیادہ جوان مرد اور عورتیں آگے بڑھ بڑھ کر کہنے لگے :۔

"سورج کے سفر پر مَیں جاؤں گا ۔مَیں تجھ سے زیادہ تنومند ہوں !"

"نہیں ——! مجھے جانا چاہیے ۔مَیں لڑکی ہوں اور زیادہ ہوشیاری

سے سورج تک پہنچ سکتی ہوں —!"

"مَیں سب سے زیادہ تیز چل سکتا ہوں۔ اور سب سے جلدی اپنی منزل پہ پہنچ جاؤں گا!"

جب مجمعے میں ہر شخص اس طرح کے دعوے کر رہا تھا، عین اس وقت ایک دس سالہ لڑکا آگے بڑھا اور کہنے لگا:-

"میرا خیال ہے تم میں سے کوئی بھی اس سفر کے لیے مناسب نہیں ہے۔ صرف مَیں جا سکتا ہوں!"

تمام لوگوں نے بڑے تعجب سے اس ننھے لڑکے کی طرف دیکھا۔ اکثر لوگ اس کا مذاق اُڑانے لگے۔

"یہ بچہ کیا کہہ رہا ہے —؟ یہ تو چند میل بھی نہیں چل سکے گا۔"

"سورج کے سفر پہ جانا بچوں کا کھیل نہیں ہے"

لیکن لڑکے نے لوگوں کے مذاق کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بڑے اطمینان سے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"شاید تم سب لوگ یہ بات بھول رہے ہو کہ سورج یہاں سے بہت زیادہ دُور ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے چالیس پچاس سال کا عرصہ ناکافی ہے۔"

پھر وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا:

"سورج تک پہنچنے کے لیے اندازاً نوّے سال کا عرصہ درکار ہے۔ مَیں ابھی صرف دس سال کا بچہ ہوں اس لیے اس سفر پہ مجھے جانا چاہیے تاکہ میں جیتے جی اپنی منزل تک پہنچ سکوں۔ اس سفر کے لیے مجھ سے زیادہ اور کوئی شخص مناسب نہ ہوگا —؟"

جب اس لڑکے نے اپنی بات ختم کی تو اکثر لوگ سوچ میں پڑ گئے۔ واقعی یہ بات تو وہ بھول ہی گئے تھے کہ سورج تک پہنچنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہے۔ اگر کوئی بڑی عمر والا شخص گیا تو وہاں تک پہنچنے

سے پہلے ہی اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ یہی بات سوچ کر مجمعے میں سے اکثر لوگ اس کی تائید کرنے لگے۔

"واقعی یہ لڑکا ٹھیک کہہ رہا ہے ـــ اس کی بات قابلِ توجہ ہے"!

کسی نے کہا :-

"یہ صحت مند بھی ہے اور ہوشیار بھی"!

کوئی بولا :

"بہتر یہی ہے کہ اسے جانے دیا جائے!"

کسی نے رائے دی :-

"یہ ذہین بھی ہے ـــــ یہی سفر کے لیے مناسب رہے گا"!

مختلف لوگ اس لڑکے کی ذہانت اور ہوشیاری کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ ہر شخص اس بات پر متفق تھا کہ اس سفر کے لیے لڑکا ہی مناسب ہے۔ اسی کو جانے دیا جائے مگر اتنے میں مجمعے میں سے ایک عورت آگے بڑھی۔ اس عورت کا نام ماتیے تھا اور اس کی عمر بیس سال تھی۔ ماتیے تومند بھی تھی اور اس وقت اس کے پیٹ میں ایک ماہ کا بچہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور اونچی آواز میں بولی :-

"سب لوگ خاموش ہو جائیں ـــــ!"

عورت کا اتنا کہنا تھا کہ اس کے ساتھ ہی مجمعے میں سنّاٹا چھا گیا۔ سب لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں! یہ کیا کہتی ہے ـــــ؟ وہ پہلے دس سالہ لڑکے کی بات پر حیرت زدہ رہ گئے تھے اور اب یہ عورت ان کے لیے اور بھی تعجب کا باعث ہو رہی تھی۔ سب کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں اور منتظر تھے کہ :-

"دیکھیں اب یہ نئی بات کیا کہتی ہے ـــــ؟"

عورت نے دیکھا، سب لوگ خاموش ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ وہ

کچھ کہے۔ یہ دیکھ کر وہ آگے بڑھی اور سب کو مخاطب کر کے کہنے لگی :۔

" لڑکے کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سورج یہاں سے بہت زیادہ دُور ہے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس تک پہنچنے کے لیے نوّے سال کا عرصہ بھی کم پڑے گا۔"

عورت نے اتنی بات کہہ کر اپنے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کو غور سے دیکھا اور پھر بولی :۔

"بہتر یہ ہے کہ تم لوگ مجھے اس سفر پہ جانے کی اجازت دو ـــــ!"

ابھی اس نے یہ بات کہی ہی تھی کہ چاروں جانب سے لوگ شور کرنے لگے :۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ـــ؟"

"یہ کیسے جا سکتی ہے ـــ؟"

اس پہ عورت نے ایک بار پھر لوگوں کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد وہ دلیل پیش کرتے ہوئے اور انھیں سمجھانے کے سے انداز میں بولی :

"مَیں اس لیے اس سفر پہ جانا چاہتی ہوں کہ مَیں تنومند ہوں، باہمت ہوں ـــ نہ پہاڑ میرا راستہ روک سکتے ہیں اور نہ خوف ناک سانپ مجھے ڈرا سکتے ہیں ـــ نہ میں جنگلی درندوں سے ڈرتی ہوں اور نہ کوئی دوسری رکاوٹ میرے راستے میں حائل ہو سکتی ہے۔"

اس نے یہ بات کہی اور ایک بار پھر مجمعے کا جائزہ لیا۔ لوگ ابھی تک اس کی بات سے مطمئن نہ تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے اس نے کہا :۔

" اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے پیٹ میں ایک ماہ کا بچہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے مَیں اپنی منزل پہ پہنچنے میں ناکام ہو گئی تو میرا بچہ یقیناً سورج تک پہنچ جائے گا۔"

عورت کی یہ دلیل بہت وزنی تھی۔ لوگ واقعی اس کی بات کے قائل ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں آ گیا کہ اس طرح نوّے سال یا اس سے زیادہ عرصے میں طے ہونے والا سفر یقیناً مکمل ہو جائے گا۔ مائیے سورج تک پہنچنے اور اس کی مدد حاصل کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائے گی ـــ لہٰذا تمام بڑے چھوٹے لوگوں نے ایک آواز ہو کر کہا :

" مائیے ٹھیک کہتی ہے ـــ ہمیں منظور ہے۔ اسے ہی سفر پہ جانا چاہیے!"

اب یہ بات طے ہوگئی تھی کہ سورج کے سفر پہ ماتیے جائے گی۔ انھوں نے اس سے کہا:۔

"جب تم سورج کے پاس پہنچ جاؤ تو وہاں آگ جلا دینا تاکہ ہم دیکھ لیں اور جان جائیں کہ تم سورج کے پاس پہنچ گئی ہو۔۔"

دوسرے روز ماتیے نے ضروری تیاری کی، عزیزوں رفیقوں سے ملی اور رخصت ہو کر مشرق کی جانب اپنے سفر پہ روانہ ہوگئی۔

وہ چلتی رہی — چلتی رہی — منزلوں پہ منزلیں طے کرتی رہی۔ راستے میں پہاڑ آتے تو وہ انھیں عبور کرتی، دریا پڑتے تو ان میں سے گزرتی اور جنگل ہوتے تو انھیں پار کرتی اس نے نہ دشوار گزار راستوں کی پروا کی اور نہ سفر کی جان لیوا مصیبتوں کو خاطر میں لاتی۔ بھوک کی شدت بھی جھیلی اور پیاس کی تکلیف بھی برداشت کی — یہاں تک کہ اسے چلتے چلتے آٹھ ماہ کا عرصہ گزر گیا اور اس نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ اس نے چند روز آرام کیا اور اس کے بعد اپنے بچے کو گود میں لے کر پھر سے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے سفر پہ روانہ ہوگئی۔

وقت گزرتا رہا — دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں، اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ ماتیے کو سفر پہ روانہ ہوئے ستّر سال بیت چکے تھے۔ اس ستر سال کے طویل عرصے میں اس نے ان گنت مصائب کا سامنا کیا تھا، بے شمار دشواریوں سے دوچار ہوئی تھی، اور اب وہ اس قابل نہ رہی تھی کہ اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔ ایک طرف سفر کی تکان تھی اور دوسری طرف بڑھاپا اس کے پاؤں کی زنجیر بن چکا تھا۔ وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ اس سے جب تک ہو سکا وہ چلتی رہی، جب تک ہمت نے ساتھ دیا وہ آگے بڑھتی رہی مگر اب وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھی۔ اب سفر کو جاری رکھنا اس کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔ چنانچہ راستے میں ایک گاؤں پڑا اور وہ اس گاؤں کے ایک کسان کے گھر میں ٹھہر گئی۔ اس نے کسان کو اپنی پوری کہانی سنائی اور بتایا کہ:

"اس اس طرح وہ سورج کے سفر پہ روانہ ہوئی تھی — اور اب اس کا بیٹا آگے

جائے گا تاکہ سورج تک پہنچ کر اس سے دی چینگ لوگوں کی مدد کے لیے کہا جائے"!

اس کے بعد ماتیہ خود تو اس کسان کے گھر میں ٹھہر گئی اور اپنے بیٹے سے کہا:۔

"لو بیٹا! مَیں نے اپنا سفر پورا کر دیا!"

پھر اس نے بیٹے کو تھپکتے ہوئے نصیحت کی:۔

"اب آگے تمھاری منزل ہے — یہ فرض اب تمھیں پورا کرنا ہے"

"ہاں! تم بے فکر رہو — میں یہ فرض ضرور پورا کروں گا"

بیٹے نے جواب دیا اور پھر کہنے لگا:۔

"اب مجھے اجازت دو تاکہ سورج کا سفر جاری رکھوں —؟"

اس نے اپنے بیٹے کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ اور اب ماتیہ کی بجائے اس کا بیٹا سورج کی طرف چل دیا تاکہ وہ اپنے وعدے پر پورا اُتر سکے۔

ستّر سال کے اس طویل عرصے میں ماتیہ اور اس کے بیٹے نے ہزاروں لاکھوں بلند و بالا پہاڑوں کو عبور کیا اور گہرے اور چوڑے دریا پار کیے تھے۔ ہزاروں لاکھوں زہریلے سانپ ان کی راہ میں آئے اور خطرناک جنگلی درندوں سے ان کا سامنا ہوا تھا۔ ان ستّر سال کے سفر میں انھوں نے ہر طرح کے مصائب جھیلے تھے قسم قسم کی مشکلات سے دوچار ہوئے تھے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ وہ موت کے منہ میں جاتے جاتے بچے۔ ہر ایسے موقعے پر انھیں یوں لگتا تھا جیسے اب ان کا زندہ بچ نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے مگر انھوں نے ہمّت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ہر مشکل کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے چلے گئے۔ اس طرح وہ ہر اس رکاوٹ سے گزر گئے جو ان کی راہ میں آئی۔ ان کے دل میں صرف ایک ہی لگن تھی اور وہ یہ کہ:۔

"جلد سے جلد سورج کے پاس پہنچ جائیں!"

اور — ان کے ذہن میں صرف ایک ہی فکر تھی اور وہ یہ کہ:۔

"جس طرح بھی ہو سکے اپنی قوم کے لیے سورج کی روشنی حاصل کریں"

سفر کے دوران راستے میں انھیں اَن گنت ایسے لوگ ملے جو ان سے پوچھتے:۔

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو ---- ؟"

اور جب وہ انھیں بتاتے کہ :-

"ہم اپنی قوم کے لیے سورج کے پاس روشنی لینے جا رہے ہیں"

تو وہ ان کی ہر طرح سے مدد کرتے ۔ انھیں پہاڑوں کے آسان راستے بتاتے، دریاؤں کے پایاب حصّے سمجھاتے، انھیں دریا پار کراتے۔ ان کے کھانے پینے اور کپڑوں کا بندوبست کرتے تاکہ وہ سورج تک پہنچ جائیں ۔ اس طرح ان ماں بیٹوں نے اپنے سفر کو کہیں رُکنے نہ دیا اور آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے ۔

ماہیے کے رخصت ہونے کے بعد پیچھے وی چینگ لوگوں کے ساتھ کیا بیتی اس کی خبر نہ تو ماہیے کو تھی اور نہ اس کا بیٹا جانتا تھا ۔ اس کے جانے کے بعد وی چینگ لوگ ہر صبح بیدار ہو کر مشرق کی طرف دیکھتے تاکہ انھیں ماہیے کی جلائی ہوئی آگ نظر آ جائے ۔ گو انھیں اس بات کا علم تھا کہ سورج تک پہنچنے کے لیے نوّے سال کا طویل عرصہ درکار ہے مگر اس کے باوجود وہ دوسرے ہی روز سے مشرق کی طرف دیکھنے لگے تھے ۔ ہر شخص صبح اُٹھتے ہی فوراً مشرق کی سمت دیکھتا کہ :-

"شاید ماہیے سورج کے پاس پہنچ گئی ہو؟ شاید اس نے وہاں پہنچ کر آگ جلا دی ہو؟"

مگر انھیں ہر روز مایوسی ہوتی تھی ۔ مشرق کی طرف کہیں آسمان پہ آگ جلتی ہوئی نظر نہ آتی ۔ دن ہفتوں میں ڈھلتے گئے، ہفتے مہینوں کا روپ دھارتے گئے اور مہینے برسوں کی گود میں دم توڑتے گئے ۔ ایک برس کے بعد دوسرا برس آتا اور جاتا رہا ---- یہاں تک کہ ستّر برس کا طویل عرصہ بیت گیا اور انھیں مشرق کی سمت آسمان پہ آگ دکھائی نہ دی ۔ وی چینگ لوگ بالکل مایوس ہو چکے تھے ۔ ان کی ساری اُمیدیں ختم ہو گئی تھیں ۔ انھوں نے سوچ لیا کہ :-

"ماہیے راستے میں کہیں مر کھپ گئی ہو گی !"

وہ ابھی تک بدستور اندھیروں میں زندگی گزار رہے تھے۔ وہ اب بھی سورج کی روشنی اور گرمی سے محروم تھے۔ ان کے چاروں طرف اسی طرح خوں خوار شیر دھاڑتے پھرتے تھے، چیتے چنگھاڑتے پھرتے تھے، طرح طرح کے جنگلی درندے منہ پھاڑے گھومتے نظر آتے تھے۔ روشنی کی اُمید ان کے دلوں میں تڑپ رہی تھی، اور ماتیے ان کے لیے خواب بن چکی تھی۔

آخر وہ وقت بھی آگیا، جب ماتیے کو سورج کے سفر پہ روانہ ہوئے نوّے سال پورے ہونے میں صرف ایک روز باقی رہ گیا تھا اور وی چنگ لوگوں کے دلوں میں اُمید کی آخری کرن بھی دم توڑ رہی تھی۔ ہر شخص کا دل دھڑک رہا تھا، ہر آدمی سوچ میں گم تھا۔ دوسری صبح نوّے سال کی آخری صبح تھی۔ اس طرح اُمید کے سارے دروازے بند ہونے والے تھے۔ سب لوگ دھڑکتے دلوں کے ساتھ مشرق کی سمت نظریں جمائے ہوئے تھے ـــــ اچانک انھوں نے دیکھا، مشرق کی طرف آسمان پہ ایک بہت بڑا شعلہ بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی سارے آسمان پہ خون جیسی سُرخی پھیل گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سونے جیسی سُنہری کرنیں بکھیرتا ہوا سورج آہستہ آہستہ طلوع ہونے لگا اور ساری دُنیا کے کونے کونے میں روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ جہاں وی چنگ لوگ اندھیرے میں رہ رہے تھے، وہاں ہر جانب اُجالے بکھر گئے تھے ـــــ صدیوں کے اندھے اندھیرے پلک جھپکتے میں غائب ہوگئے اور تاریکی چھٹنے کے ساتھ ہی دھاڑتے ہوئے خوں خوار شیر، چنگھاڑتے ہوئے چیتے، پھنکارتے ہوئے اژدھے، غرّاتے ہوئے بھیڑیئے اور دوسرے تمام خوف ناک درندے اس طرح غائب ہوگئے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ موت کا ہر روپ ختم ہو چکا تھا اور زندگی سورج کی روشنی بن کر ہر طرف رقص کر رہی تھی۔

اس بات کو صدیاں بیت گئیں ـــــ کہتے ہیں وہ دن اور آج کا دن، اب بھی وی چنگ کسان بہادر ماتیے اور اس کے دلیر بیٹے کو خراجِ تحسین

ادا کرنے کے لئے ہر روز سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی اپنے کھیتوں میں چلے جاتے ہیں ـــــ دن بھر جی لگا کر محنت کرتے ہیں اور اس وقت تک کام کرتے رہتے ہیں جب تک سورج غروب نہیں ہو جاتا ـــــ پھر جب وہ رات کو گھروں کو لوٹتے ہیں تو سونے سے پہلے اپنے بچوں کو ماتیبے اور اس کے بیٹے کی بہادری کی کہانی سناتے ہیں۔ اس سورج کی کہانی جو آج دنیا میں ہر طرف چمک رہا ہے ـــــ وہ سورج جسے ماتیبے اور اس کے بیٹے نے تلاش کیا تھا!

بہادر شیگار

THE STORY OF HERO
SHIGAR



آج سے صدیوں پہلے کی بات ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آسمان پر سات سورج اور چھ چاند طلوع ہوتے تھے۔ اس وقت ساری دنیا روشن تھی اور ہر جگہ موسم گرم رہتا تھا۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ تمام پرندے اور چرندے اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے۔ دھرتی پہ زندہ رہنے والے ہر جان دار کو امن اور سکون حاصل تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب شیگار پیدا ہوا۔ بچپن کی حد سے گزر کر جب وہ جوانی میں داخل ہوا تو اس کی شادی ہوگئی۔ پہلی شادی کے بعد پھر اس نے دوسری شادی کی اور اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے اسے یوں ہی خیال آیا۔

"ساری دُنیا کا سفر کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا ہر جگہ انسان اور جانور خدا کی مرضی کے مطابق خوشی سے زندگی گزار رہے ہیں یا نہیں ——؟"

وہ کئی روز تک اپنے اس ارادے کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اپنی دونوں بیویوں کو اپنے پاس بُلا کر کہنے لگا۔

"میں ساری دُنیا کے سفر پہ جانا چاہتا ہوں —— میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہر جگہ لوگ خدا کی مرضی کے مطابق ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں یا نہیں ——؟"

اس کی دونوں بیویاں اس سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ وہ اس کی بات سُن کر گھبرا گئیں۔ انھوں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"دُنیا تو بہت بڑی ہے۔ اس کے سفر کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہے — اگر تم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تو ہم کیا کریں گی؟"

"نہیں — مجھے اس سفر پر ضرور جانا چاہیے!"

اس نے اپنا آخری فیصلہ سُناتے ہوئے کہا۔ پھر وہ انھیں تسلّی دیتے ہوئے بولا۔

"تم فکر نہ کرو — میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔"

شیگار مشرقی سمندر کے ایک جزیرے میں رہتا تھا۔ اس نے اپنی بیویوں کے لیے کھانے پینے کے سامان کا اتنا ذخیرہ کر دیا جو بہت دنوں تک چل سکتا تھا۔

"میرے آنے تک کے لیے یہ سامان کافی ہوگا — تم میری فکر نہ کرنا۔"

دونوں بیویوں نے اسے بہتیرا روکنا چاہا مگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔ اس نے اسی وقت اپنا اُڑنے والا تیز رفتار گھوڑا تیار کیا، اپنی تلوار سنبھالی اور بیویوں کو خدا حافظ کہہ کر پوری دُنیا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دراصل شیگار یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا ساری دُنیا میں انسان اور جانور، چرندے اور پرندے، خدا کی مرضی کے مطابق ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں یا نہیں۔ سب ایک دوسرے سے برابری کا برتاؤ کرتے ہیں یا نہیں —؟ سب کو خوش حالی حاصل ہے یا نہیں —؟ اس کے دل میں یہی ایک خیال سمایا ہوا تھا کہ خدا یہی چاہتا ہے۔ ہر انسان اور جانور ایک دوسرے کے برابر اور سکون سے زندہ رہے۔ کوئی کسی کو نقصان نہ پہنچائے، کوئی دوسرے کو دُکھ نہ دے اور کوئی کسی کا سکون نہ چھینے۔ اس کا اُڑنے والا گھوڑا انتہائی برق رفتار تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ چند روز میں ساری دُنیا گھوم کر دیکھ لے گا۔ چنانچہ وہ گھر سے نکلا، گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دُنیا کے سفر پر چل نکلا۔

وہ ایک عرصے تک سفر کرتا رہا۔ کئی ملک آئے اور گزر گئے۔ کبھی وہ سمندر پر سے گزرتا اور کبھی خشکی پر سے، کبھی کسی جنگل کو عبور کرتا اور کبھی کسی شہر پر سے ہوتا ہوا نکل جاتا۔ اس طرح وہ دریاؤں، جنگلوں، پہاڑوں اور آبادیوں پر سے اُڑتا ہوا دن رات اپنے سفر پر جاری و ساری رہا۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے ایک روز وہ ایک بلند ہموار میدان پر سے گزر رہا تھا۔ یہ بلند ہموار میدان لیانگ شان پہاڑ کے ساتھ واقع تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا، پرندوں کا ایک غول

بڑی غمگین آوازوں میں چیخ پکار کر رہا تھا۔ وہاں قسم قسم کے پرندے جمع تھے اور ہر پرندہ چیخ چیخ کر شور کر رہا تھا۔ گو ان کی آوازیں بے ہنگم سی تھیں لیکن ان میں بڑا درد تھا شیگار کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔

"میں نے آدھی دُنیا سے زیادہ کا سفر کیا ہے۔ ہر جگہ انسان، جانور اور پرندے سکون اور برابری کی زندگی بسر کر رہے ہیں — مگر یہ پرندے اس طرح اداس اور غمگین کیوں ہیں —؟ ان پر کیا مصیبت آئی ہے —؟"

اس نے اپنے گھوڑے کی باگیں ان کی طرف موڑ دیں اور فضا میں سے زمین پر آ گیا۔ پھر وہ گھوڑے سے اُترا اور ان پرندوں کے قریب چلا گیا۔ اس نے دیکھا بے شمار پرندے دُکھ بھری آوازوں میں شور کر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ سب کے سب کسی ایک ہی دُکھ میں مبتلا ہیں۔ شیگار تھوڑی دیر تک ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ جب سب پرندے خاموش ہو گئے تو اس نے ان سے دریافت کیا۔

"ساری دنیا میں تمام پرندے اور جانور ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں سب امن چین سے ہیں مگر تم اس قدر غم زدہ کیوں ہو —؟ تم پر ایسی کیا مصیبت آئی ہے جو اس طرح چیخ رہے ہو —؟"

شیگار کے اتنا کہنے پر تمام پرندے اس کی طرف متوجہ ہو گئے — یہ آدمی کون ہے جو ان کا دُکھ معلوم کرنا چاہتا ہے —؟ سب کے سب اسے دیکھ کر سوچ رہے تھے۔ اتنے میں ایک بھورے رنگ کی لارک آگے بڑھی اور بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بولی۔

"کیا کہا —؟ تمام پرندے اور جانور سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں —؟"

جب وہ یہ بات کہہ رہی تھی تو اس کی آواز میں دُکھ کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اسے شیگار کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ اس نے شیگار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پرانی بات ہے جب تمام پرندے اور جانور سکون سے رہتے تھے — آج کے زمانے میں ہم بدنصیبوں کو سکون کہاں حاصل ہے —؟"

"میں نے آدھی دنیا کا سفر کیا ہے اور اس دھرتی پر ہر جگہ چرندوں پرندوں کو پُر سکون زندگی گزارتے دیکھا ہے ــــــ؟"

شیگار نے یہ کہتے ہوئے تعجب سے لارک کی طرف دیکھا۔

"دیکھا ہوگا ــــــ!"

یہ لارک کا جواب تھا۔ اسے ابھی تک شیگار کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا مجھے بتا سکتے ہو کہ تم لوگ کس مصیبت میں گرفتار ہو جو اس طرح غم زدہ چیخ رہے ہو ــــ؟"

شیگار کے اتنا پوچھنے پر لارک کہنے لگی۔

"جب سے پہاڑیں سے ایک بہت بڑا اژدھا نکلا ہے، اس نے ہمارا سارا سکون چھین لیا ہے۔ ہمارا زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"کیا کہا ــــ اژدھا ــــ؟ کیسا اژدھا ــــ؟"

شیگار نے حیرانی سے سوال کیا۔

"ہاں اژدھا ــــ ایک بہت بڑا اژدھا ــــ جو پہاڑ کی مشرقی سمت سے نکلا ہے"

لارک نے یہ بات کہی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے پھر اس نے غم میں بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"یہ اژدھا اپنے طاقت ور اور موٹے جسم کو اور زیادہ طاقت ور بنانے کے لیے چھ کے چھ چاندوں کی روشنی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور سات سورجوں کی گرمی حاصل کر کے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بنا لیتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس قدر طاقت ور اور بڑا ہے کہ اس دھرتی پر اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چھ چاندوں کی روشنی اور سات سورجوں کی گرمی نے اسے انتہائی طاقت بخش کر ناقابلِ شکست بنا دیا ہے۔"

لارک اتنا کہہ کر ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولی

"یہ خوف ناک اژدھا اپنے لیے خوراک تلاش نہیں کرتا۔ وہ ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم ہر روز اسے ایک پرندے کی قربانی پیش کریں۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر کسی روز مجھے پرندہ

نہ دیا گیا تو میں یہاں کے تمام پرندے ختم کر دوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے ہر روز باری باری ایک پرندہ پیش کرتے ہیں جسے وہ کھا جاتا ہے ——— بدقسمتی سے آج چکور کی باری ہے اور اس وقت ہم سب اسے خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔"

شیگار نے جب لارک کی ساری بات سُنی تو اسے چکور اور دوسرے پرندوں پر بڑا رحم آیا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے ان سے کہنے لگا۔

"تم ہر روز اژدھا کو ایک پرندہ پیش کرنے کی بجائے اس سے جنگ کیوں نہیں کرتے؟ سب مل کر اس کا مقابلہ کرو۔ اس طرح تمھاری روز روز کی مصیبت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی ———؟"

جوں ہی شیگار نے یہ بات کہی اس کے ساتھ ہی تمام پرندے اپنی اپنی آوازوں میں پھر شور کرنے لگے لیکن ان سب میں لارک کی آواز صاف اور بلند تھی۔ اس نے کہا۔

"جنگ ———؟ اژدھا سے جنگ ———؟ شاید تمھیں نہیں معلوم کہ وہ کس قدر طاقت ور ہے ——— اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی مقابلہ کر ہی نہ سکتا ہو ———؟"

شیگار نے یہ کہا اور اس پر لارک نے جواب دیا۔

"اسے شکست دینے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے ساتوں سورجوں اور چھیئوں چاندوں کی روشنی اور گرمی چھین لی جائے۔ اسی روشنی اور گرمی سے ہی اس کے جسم میں اس قدر زیادہ طاقت ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کی ساری قوت ختم ہو جائے گی۔ وہ سُکڑ کر پھر سے اپنی اصلی حالت میں آجائے گا اور سردی سے ٹھٹھر کر خود بخود مر جائے گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے ——— اس کا صرف ایک یہی علاج ہے!"

تمام پرندوں نے لارک کی تائید کی۔

"مگر یہ کام کون کرے گا ———؟ یہ بہت مشکل کام ہے!"

لارک نے بڑے مایوس لہجے میں کہا۔ اس پر شیگار نے اس کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"تم سب بے فکر رہو ——— یہ کام میں کروں گا ——— میں اس سے چھیئوں چاندوں

کی روشنی اور ساتوں سورجوں کی گرمی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لوں گا۔"

شیگار نے پرندوں سے یہ بات کہی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی کمان نکالی، چلّے پہ تیر چڑھایا اور آسمان کی طرف رُخ کر کے ایک سورج پر چلا دیا۔ جوں ہی شیگار کا چھوڑا ہوا تیر ایک سورج پر جا کر لگا اس کے ساتھ ہی وہ سیاہ دھوئیں کے ایک گولے میں تبدیل ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نیچے آ گرا۔ شیگار نے دوسرا تیر چلّے پر چڑھایا اور نشانہ باندھ کر دوسرے سورج پر چلا دیا۔ اس بار تیر دوسرے سورج پر جا کر لگا اور تیر لگنے کے ساتھ ہی وہ بھی پہلے سورج کی طرح سیاہ دھوئیں کے ایک گولے میں تبدیل ہو کر نیچے آ گرا۔ اس کے بعد شیگار نے تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے سورج پر اسی طرح تیر چلائے اور وہ سب کے سب باری باری سیاہ دھوئیں میں تبدیل ہو کر نیچے آ گرے۔ جب وہ ساتویں سورج کی طرف تیر چلانے لگا تو ساتواں سورج بلند آواز میں پکارا۔

"رُک جاؤ ــــ! شیگار رُک جاؤ ــــ!!"

شیگار تیر چھوڑنے ہی والا تھا مگر جب ساتویں سورج نے اسے روکا تو وہ رُک گیا اور سورج کی طرف دیکھتے ہوئے انتظار کرنے لگا کہ وہ کیا کہتا ہے ــــ؟ اب آسمان پر صرف ایک سورج رہ گیا تھا، باقی چھ شیگار کا تیر لگنے سے نیچے آ گرے تھے ــــ ساتویں سورج نے شیگار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نے مجھے بھی نیچے گرا دیا تو ساری دُنیا میں گرمی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی ــــ دھرتی پر موجود تمام چیزیں سردی سے دم توڑ دیں گی۔ یہاں تک کہ تم خود بھی زندہ نہ رہ سکو گے۔"

شیگار کے ہاتھ کمان پر جہاں تھے وہیں رُک گئے ــــ واقعی ساتواں سورج صحیح کہہ رہا تھا ــــ اگر دُنیا میں گرمی نہ رہی تو ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ گرمی کے بغیر کیسے زندہ رہا جا سکتا ہے ــــ؟ چرند، پرند، جانور، انسان، پودے، درخت، ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ ان سب کو گرمی کی ضرورت ہے۔ گرمی کے بغیر زندگی کا وجود ختم ہو جائے گا۔ شیگار یہ سب کچھ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

"اے ساتویں سورج ——— ! تم ٹھیک کہتے ہو !"

شیگار نے کچھ سوچتے ہوئے سورج کو مخاطب کیا۔

"لیکن میری ایک بات یاد رکھو ——— اور وہ یہ کہ آج سے تم خبیث اور دوسروں کو نقصان پہنچانے والے جانوروں پر نہیں چمکو گے ——— ؟"

دوسری طرف پرندوں نے جب دیکھا کہ باری باری چھ سورج آسمان سے نیچے آ گرے ہیں تو وہ سب مل کر خوشیاں منانے لگے۔ کوئی شور کر رہا تھا، کوئی خوشی میں طرح طرح کی آوازیں نکال رہا تھا اور کوئی ناچ رہا تھا۔ سب کے سب مسرت میں ناچ کود رہے تھے کہ اب ہمیشہ کے لیے اژدہا کے ظلم سے نجات پا جائیں گے۔ وہ سب اسی وقت ایک بہت بڑے گروہ کی صورت میں اژدہا کے غار کی جانب چل دیئے تاکہ دیکھیں، وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے ——— ؟ جب وہ غار کے دہانے پر پہنچے تو انھوں نے دیکھا، اژدہا ابھی تک زندہ تو تھا مگر سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا۔ اپنے آپ کو سردی سے بچانے کے لیے وہ گندگی مارے بُری طرح کانپ رہا تھا۔ تاہم وہ ابھی تک زندہ تھا اور پرندے اس سے پوری طرح محفوظ نہ ہوئے تھے۔ پرندے اسے اس حالت میں دیکھ کر آپس میں مشورے کرنے لگے

"ابھی یہ زندہ ہے ——— ابھی ہم اس سے محفوظ نہیں ہوئے۔"

"جب تک چھ چاند باقی ہیں، اس وقت تک یہ ہمیں نقصان پہنچاتا رہے گا۔"

"ابھی چاندوں کی روشنی سے اس میں طاقت باقی ہے۔"

تھوڑی دیر تک پرندے اسی طرح آپس میں باتیں کرتے اور سوچتے رہے۔ آخر انھوں نے طے کیا اور اسی وقت ایک چھوٹے باز کو شیگار کی طرف روانہ کر کے اس سے کہا۔

"بہادر شیگار کو پیغام دو کہ ابھی ہم اژدہا سے پوری طرح محفوظ نہیں ہوئے۔ اگر تم چھوں چاندوں کو بھی اسی طرح نیچے گرا دو تو ہماری زندگیاں سدا کے لیے محفوظ ہو جائیں گی ——— ابھی اژدہا میں طاقت باقی ہے اور جب تک چھ چاندوں کی روشنی ختم نہ ہو گی اس کی طاقت باقی رہے گی۔"

چھوٹا باز اسی وقت اڑا اور آناً فاناً میں اُڑتا ہوا شیگار کے پاس جا پہنچا۔ اس نے شیگار کو پرندوں کا پیغام دیا اور شیگار نے وقت ضائع کیے بغیر دوبارہ اپنی کمان سنبھال لی۔ اس نے چلّے پر تیر چڑھایا اور نشانہ تاک کر چھ چاندوں میں سے ایک پر چلا دیا۔ چاند کو تیر کا لگنا تھا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے نیچے آگرا۔ اس نے دوسرا تیر چھوڑا اور دوسرا چاند بھی نیچے آگرا۔ پھر تیسرا، چوتھا، اور پانچواں چاند بھی اسی طرح نیچے آرہا۔ جب وہ چھٹے چاند کا نشانہ باندھ کر تیر چلانے لگا تو چاند نے پکار کر کہا۔

”رُک جاؤ ـــــ شیگار رُک جاؤ ـــــ!“

شیگار نے آواز سن کر ہاتھ روک لیا اور چاند کی طرف دیکھنے لگا۔ چاند کہنے لگا

”اگر تم نے مجھے بھی نیچے گرا دیا تو ساری دنیا سے روشنی ختم ہو جائے گی۔ ہر جان دار یہاں تک کہ تم خود بھی اندھے ہو جاؤ گے اور اندھیرے میں بھٹک بھٹک کر ختم ہو جاؤ گے“

واقعی چاند کی بات ٹھیک ہے۔ روشنی کے بغیر تو کوئی زندہ نہیں رہ سکتا ـــــ! شیگار اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

”اے چھٹے چاند ـــــ تم ٹھیک کہتے ہو ـــــ میں تمھیں نہیں گراؤں گا۔“

شیگار اتنا کہہ کر لمحہ بھر کے لیے رُکا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔

”مگر اتنی بات یاد رکھو کہ آج سے تم کسی خبیث اور دوسروں کو نقصان پہنچانے والے جانور پر نہیں چمکو گے!“

شیگار چاند سے یہ کہہ کر چھوٹے باز کو ساتھ لیے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے آگیا جب وہ بلند ہموار میدان میں پہنچا تو اس نے دیکھا، وہاں عجیب سماں تھا۔ تمام پرندے خوشی میں ناچ رہے تھے۔ ان کی زندگی میں یہ انتہائی خوشی کا دن تھا۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے اژدہا کے ظلم سے نجات پا گئے تھے۔ کوئی پرندہ ناچ رہا تھا، کوئی اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہا تھا، کوئی دوسرے سے چونچیں لڑا رہا تھا اور کوئی مسرت میں جھوم جھوم کر دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اس طرح ہر قسم اور ہر رنگ کے پرندے جمع ہو کر خوشیاں منا رہے تھے۔ ہر جانب ایک جشن کا سا سماں تھا شیگار نے جب انھیں اس طرح خوش دیکھا تو اس کے دل کو بڑا سکون ملا۔ وہ خود بھی خوش تھا کیونکہ

اس کی وجہ سے ان سب کی جان بچ گئی تھی۔ وہ پرندوں کو ناچتے کودتے دیکھ رہا تھا کہ ننھے میں لارک اور چکور پر اس کی نگاہ پڑی چمک پڑی چمک پڑتے ہی انھیں شیگار کا خیال آیا۔ وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھ کر آئے اور تمام پرندوں کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"اے بہادر شیگار ـــ ! ہم تمام پرندوں کی جانب سے تمھارا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔"

وہ اس کا احسان مند ہوتے ہوئے بولے۔

"جس اژدہا نے ہمارا سکون برباد کر رکھا تھا، وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر چکا ہے۔ ہماری زندگی کی خوشیاں لوٹ آئی ہیں۔ تم نے ہم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اگر دُنیا کے تمام پرندے مل کر بھی تمھارا شکریہ ادا کریں تو بھی ادا نہ ہوگا۔"

"اس میں شکریئے کی کوئی بات نہیں ـــ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اب تم ہمیشہ اسی طرح خوش رہو ـــ تمھاری زندگیاں خوشیوں سے بھری رہیں اور کوئی تمھیں نقصان نہ پہنچائے۔"

شیگار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور سب سے رخصت ہو کر اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گیا ابھی اسے پوری دُنیا گھوم کر دیکھنا تھی۔

شیگار اپنے اُڑنے والے گھوڑے پر سوار سفر کرتا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ بہت جلد ایک ایسے گاؤں میں پہنچ گیا جس کے چاروں طرف اونچی دیوار تھی۔ وہ سیدھا اس بڑے دروازے پر پہنچا جہاں سے گاؤں میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا، گاؤں کے بازاروں اور گلیوں میں لوگوں کا ایک ہجوم افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ ہر آدمی پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک سڑک کے کنارے گھوڑا روک لیا اور وہاں کھڑے ہو کر لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ پریشان اور غمزدہ چہرے دیکھ کر اسے بڑا دُکھ بھی تھا اور تعجب بھی ہو رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے سوچا۔

"یقیناً اس گاؤں میں کوئی بہت ہی المناک واقعہ پیش آیا ہے۔ اسی لیے لوگ اس طرح غمزدہ اور پریشان گھوم رہے ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر انہی خیالات میں کھویا رہا اور پھر گھوڑے کی پشت سے نیچے اتر آیا۔ اس

کے قریب سے ایک بوڑھی عورت گزر رہی تھی، اس نے اُسے روکا۔

"بڑی اماں ——!"

اس نے بڑے دھیمے لہجے میں سر کو جھکا کر اس سے دریافت کیا۔

"ساری دُنیا خوشی اور سکون کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ پھر تم لوگ یہاں اس قدر غمزدہ اور پریشان کیوں ہو ——؟ کیا تم مجھے اس کی وجہ بتا سکتی ہو ——؟"

"کیا کہا ——؟ ساری دنیا خوشی اور سکون سے رہ رہی ہے ——؟"

بڑھیا نے اُلٹا اس سے سوال کر دیا۔ اس کے لہجے میں طنز کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔ پھر وہ افسوس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہم بھی کبھی خوشی اور سکون میں زندگی گزار رہے تھے مگر اب یہ ماضی کی بات بن چکی ہے اب ہماری زندگی میں خوشی اور سکون باقی نہیں رہا۔"

بڑھیا نے اتنا کہہ کر شیگار کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"کیا تم نے ہمارے گاؤں میں کوئی ایک بھیڑ یا گائے دیکھی ہے ——؟ گاؤں سے باہر گھاس گھٹنوں گھٹنوں ہو گئی ہے چشموں کا سارا پانی زمین میں سما کر ضائع ہو جاتا ہے پورے گاؤں میں ایک بھیڑیے کے سوا کوئی مویشی نہیں بچا —— اور اب انسانوں کی باری ہے کہ وہ خوراک بنیں!"

اتنا کہنے کے ساتھ ہی بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کراہنے کے سے انداز میں اپنے سر کے سفید بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ میرے خدا ——! کیا میں اس بڑھاپے میں یہی کچھ دیکھنے کے لیے زندہ ہوں؟"

بڑھیا کی باتیں سُن کر شیگار قدرے حیرانی سے بولا۔

"تو کیا یہاں بھی کسی نے تم لوگوں کا امن چین لوٹ لیا ہے ——؟"

پھر وہ جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"دھرتی پہ امن چین ہونا چاہیے —— ہر جان دار کو خوشی اور سکون حاصل ہونا چاہیے۔"

اللہ کی یہی مرضی ہے کسی کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ دوسروں کا سکون چھینے۔"

شیگار لمبے قد کا ایک خوب صورت نوجوان تھا اور اس کی آواز بلند اور گھن گرج والی تھی۔ جب وہ بڑھیا سے باتیں کر رہا تھا تو ادھر ادھر سے بہت سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ انہی لوگوں میں سے ایک بوڑھے شخص نے اسے بتایا۔

"سمندر کے مغربی حصے سے ایک خوف ناک سمندری بلا نکلتی ہے اور وہ ہمیں نقصان پہنچانے کے لیے اکثر یہاں آتی ہے۔ وہ ہماری بے شمار گائیں اور بھیڑیں کھا چکی ہے لیکن اب وہ سست اور کاہل ہو گئی ہے۔ اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ہر روز اس کی خوراک سمندر کے کنارے پہنچایا کریں چنانچہ ہم اس کے حکم کے مطابق ہر روز اس کی خوراک سمندر کے کنارے پہنچاتے ہیں۔ اس نے کہہ رکھا ہے کہ اگر کسی روز خوراک نہ پہنچائی گئی تو وہ ہمارے گاؤں کو سمندر کی تہہ میں ڈبو کر سب کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گی۔"

بوڑھا آدمی جب یہ بات شیگار کو بتا رہا تھا تو وہ بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ اتنے میں لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتا ایک نوجوان آگے بڑھا اور اس نے شیگار کو بتایا۔

"اس خوف ناک سمندری بلا نے ہمارے گاؤں کی تمام گائیں بھیڑیں کھالی ہیں بس صرف ایک بھیڑ باقی ہے اور اس کے بعد انسانوں کی باری ہے۔ اب ہم باری باری اس کا نوالہ بنیں گے۔"

جوں ہی اس نوجوان نے اپنی بات ختم کی اس کے ساتھ ہی ایک اور آدمی بول پڑا۔

"ہمیں جادوگر نے بتایا ہے کہ یہ سمندری بلا بڑی خطرناک ہے اور ہماری دشمن ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اس کا حکم بجالاتے ہیں اور اس کی خوراک سمندر کے کنارے پہنچا دیتے ہیں۔"

شیگار نے اس آدمی کی بات سُن کر پوچھا۔

"یہ جادوگر کہاں رہتا ہے ——؟"

"اسی گاؤں میں اس کا گھر ہے،"

ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں

"کیا تم مجھے اُس کے پاس لے چلو گے ——؟"

شیگار کے اتنا کہنے پہ ایک ساتھ دو تین آدمی آگے بڑھ کر بولے۔

"ہم ابھی لے چلتے ہیں —— اس کا گھر قریب ہی ہے۔"

شیگار ان آدمیوں کے ساتھ جادوگر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ ساتھ کئی اور لوگ بھی تھے۔ جب وہ جادوگر کے پاس پہنچے تو جادوگر ایک اجنبی کو دیکھ کر قدرے حیران تھا مگر شیگار نے جلد ہی اس کی حیرانی دُور کر دی۔ اس نے جاتے ہی بلند آواز میں اس سے پوچھا۔

"تم اس خطرناک سمندری بلا کے بارے میں کیا جانتے ہو ——؟"

"میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں!"

جادوگر نے جواب دیا —— پھر جوں ہی اس نے شیگار کے چہرے کی طرف دیکھا اُس نے دونوں آنکھیں جھکالیں۔ اس میں اتنی تاب نہ تھی کہ شیگار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا۔

"جب تم سب کچھ جانتے ہو تو پھر تمھاری دعائیں اور جادو کس کام کا ——؟"

شیگار نے ذرا سخت لہجہ میں سوال کیا۔

"تم یہ دیکھ رہے ہو کہ تمھارے گاؤں کے آدمیوں کو سمندری بلا کھائے جا رہی ہے۔ وہ اس کی خوراک بن رہے ہیں، تم نے اس کے لیے کیا کچھ کیا ہے ——؟"

جادوگر اس سوال سے گھبرا سا گیا۔ اسے یہ توقع نہ تھی کہ اس سے اس قسم کا سوال کیا جائے گا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا اور پھر دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

"میں نے اپنے خاموش لبوں سے بے شمار دعائیں مانگی ہیں اور میرا دل بہت افسردہ ہے۔"

اس نے یہ جملہ اس طرح کہا جیسے افسوس کے ساتھ ساتھ اپنی مایوسی کا اظہار کر رہا ہو —— پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن یہ خوف ناک سمندری بلا دعاؤں اور جادو سے قابو میں نہیں آسکی۔ جب یہ پانی میں ہوتی ہے تو دکھائی نہیں دیتی اور جب یہ سمندر سے نکل کر باہر زمین پر آتی ہے تو ناقابلِ شکست ہوتی ہے۔ اس کے جسم پر اگر نو بار بھی چاقو کا وار کیا جائے تو اسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا ___ اسے زخم تک نہیں آسکتا۔"

جادوگر اتنی بات کہہ کر پھر رُک گیا۔ اس کے بعد کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔

"اسے صرف آگ میں جلا کر ختم کیا جا سکتا ہے ___ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسے کیسے جلائیں ___؟"

سب لوگ خاموش کھڑے جادوگر کی باتیں سُن رہے تھے۔ جب اس نے یہ بتایا کہ سمندری بلا صرف آگ سے ختم ہو سکتی ہے اور اسے آگ میں جلانا ممکن نہیں تو شیگار بولا۔

"مگر اس کا کوئی راستہ تو ہوگا ___؟ ہمیں کوئی نہ کوئی ترکیب سوچنی چاہیے ___!"

شیگار نے اتنا کہہ کر سر کو جھکا لیا اور کچھ سوچنے لگا۔ سب لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ دیکھیں شیگار کون سی ایسی ترکیب سوچتا ہے جس سے سمندری بلا کا خاتمہ کیا جا سکے اور وہ امن چین کی زندگی گزار سکیں۔

"ہمیں جلدی بتاؤ وہ کون سی ترکیب ہے جس سے یہ بلا ختم ہو سکتی ہے ___!"

دو ایک آدمیوں نے بے صبری سے دریافت کیا۔ ان کے جواب میں شیگار نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ جیسے اسے کچھ سوجھ گیا ہو ___ پھر وہ تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"تم سب بے فکر رہو ___ میں اس کی کوئی نہ کوئی ترکیب نکالتا ہوں ___ تم میرا انتظار کرو میں ابھی واپس آتا ہوں۔"

شیگار نے اتنا کہا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بڑی تیزی سے سیدھا مشرق کی سمت روانہ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ ایک پہاڑ پر پہنچ گیا۔ یہ پہاڑ لوہے کا تھا، اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور یہ بہت بڑا تھا۔ وہاں دور دور تک ہریالی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نہ کوئی درخت نظر آ رہا تھا اور نہ کوئی پودا دکھائی دے رہا

تھا۔ یہاں تک کہ گھاس کا تنکا تک کہیں نظر نہ آتا تھا۔ شیگار نے پہلے اس پہاڑ کے ارد گرد تین چکر لگائے اور اس کے بعد ایک جگہ رُک کر لوہے کی تین سلاخیں اٹھالیں۔ ان سلاخوں کی موٹائی اتنی تھی جتنی کہ کسی بڑے پیالے کی گولائی ہوتی ہے۔ اس نے تینوں سلاخیں گھوڑے پہ رکھیں اور سوار ہو کر پھر وہیں پہنچ گیا جہاں گاؤں میں لوگ اس کے انتظار میں جمع تھے شیگار نے گاؤں سے پہاڑ تک آنے جانے کا یہ سارا سفر صرف اتنے عرصہ میں طے کر لیا تھا جتنے میں کوئی شخص کھانا کھالے حالانکہ لوہے کا یہ پہاڑ وہاں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہاں تک کا سفر کرنا اور اس پہاڑ تک پہنچنا ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھا مگر اس نے اپنے اُڑنے والے گھوڑے پہ یہ سفر تھوڑی سی دیر میں طے کر لیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ لوہے کی سلاخیں لے کر واپس بھی آگیا تھا۔ جوں ہی وہ واپس پہنچا اس نے لوگوں سے کہا۔

"بہت سی لکڑیاں جمع کر کے سمندر کے کنارے لے چلو!"

اس کی بات سنتے ہی بہت سے لوگ لکڑیاں جمع کرنے کے لیے چل دیئے۔ انھوں نے تھوڑی ہی دیر میں سمندر کے کنارے پہ لکڑیوں کا ڈھیر کر دیا۔ شیگار خود بھی لوگوں کے ساتھ سمندر کے کنارے پہ پہنچ گیا اور اس نے لوگوں سے کہا۔

"ان لکڑیوں میں آگ لگا کر لوہے کی یہ تینوں سلاخیں ان میں رکھ دو۔۔۔۔ جب یہ انگارے کی طرح سُرخ ہو جائیں تو مجھے بتا دینا"۔

لوگوں نے جلدی جلدی لوہے کی وہ موٹی سلاخیں لکڑیوں میں رکھ کر آگ لگا دی ۔۔۔۔ اور جب وہ تپ کر سُرخ ہو گئیں تو انھوں نے شیگار کو بتایا۔

"سلاخیں انگارے کی طرح سُرخ ہو گئی ہیں"۔

اس پہ شیگار نے کہا۔

"اب اپنی آخری بھیڑ کو یہاں لاؤ اور اسے ہلاک کر دو!"

لوگوں نے اس کے کہنے پہ عمل کیا چند آدمی بھاگے بھاگے گاؤں میں گئے اور اپنی آخری بھیڑ کو وہاں لا کر ہلاک کر دیا۔ پھر انھوں نے شیگار کو بتایا

"ہم نے تمھارے کہنے کے مطابق بھیڑ لا کر ہلاک کر دی ہے ۔۔۔۔؟"

اب شیگار آگے بڑھا ــ اس نے انگارے کی طرح دہکتی ہوئی تینوں موٹی سلاخوں کو اس طرح کھڑا کر دیا کہ ان کا ایک دروازہ سا بن گیا۔ دو سلاخوں کو دائیں بائیں کھڑا کر کے تیسری کو ان پہ ٹکا دیا۔ پھر اس نے ہلاک کی ہوئی بھیڑ کو ان کے درمیان رکھ دیا اور خود دوسرے آدمیوں کے ساتھ وہاں سے دُور جا کھڑا ہوا۔ سلاخیں چونکہ سُرخ ہو رہی تھیں اس لیے جوں ہی اس نے بھیڑ کو ان کے درمیان رکھا، اس کا گوشت بھُننے لگا۔ اس وقت وہاں تیز ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو چاروں طرف پھیلنے لگی۔

پھر اچانک لوگوں نے دیکھا کہ تیز آندھی سی چلنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی سمندر کی لہروں میں ہل چل سی مچ گئی۔ سمندر میں اس قدر جوار بھاٹا آیا کہ پانی کا ایک بڑا ریلا اٹھا اور تقریباً دس فٹ تک فضا میں بلند ہوا۔ اس ریلے کے ساتھ ہی ایک سیاہ رنگ کی سمندری بلا نمودار ہوئی۔ وہ اس قدر خوف ناک اور ڈراؤنی تھی کہ دُور کھڑے لوگ اسے دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔ بلا پانی سے اوپر آئی اور سیدھی اس طرف کو لپکی جہاں کنارے پہ لوہے کی بڑی بڑی موٹی سلاخوں کے درمیان بھیڑ کا گوشت بھُن رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی گوشت کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ دہکتی ہوئی سلاخوں کے بنے ہوئے دروازے میں داخل ہو کر گوشت پہ منہ مارنے ہی لگی تھی کہ انگارہ سی دہکتی ہوئی تینوں سلاخیں اس پہ گر پڑیں۔ بیشتر اس کے کہ وہ بھُنے ہوئے گوشت کا مزا چکھتی اس کا اپنا جسم بھُننے لگا۔ لوہے کی سلاخیں ایک تو موٹی اور وزنی تھیں اور دوسرا یہ دہک رہی تھیں چنانچہ سمندری بلا ان میں پھنس کر رہ گئی۔ آگ بنی ہوئی سلاخیں اس کے جسم میں گھُس گئیں اور وہ درد سے چیخنے چنگھاڑنے لگی۔ اس کا شور دُور دُور تک سُنائی دے رہا تھا جب اس کا جسم جلنے لگا تو وہ بُری طرح تڑپنے لگی۔ اس کے بڑے بڑے نتھنوں سے بھاپ سی نکل رہی تھی اور اس کے جلے ہوئے جسم میں سے اس طرح پانی نکل رہا تھا جیسے کوئی چشمہ بہہ رہا ہو۔ خوف ناک سمندری بلا کچھ دیر تک اسی طرح درد و کرب سے تڑپتی اور چیختی رہی ــــ اور پھر تڑپ تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

جب سمندری بلا جل کر ہلاک ہو رہی تھی، اس وقت تمام لوگ دُور کھڑے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے جو ذرا دل والے اور منچلے تھے وہ کنارے کے قریب

تھے تاکہ اپنے دشمن کی ہلاکت کو نزدیک سے دیکھ سکیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ خوف ناک بلا نے دم توڑ دیا ہے تو وہ بھاگے بھاگے اپنے ان ساتھیوں کے پاس گئے جو دُور کھڑے تھے اور انھیں بتایا کہ

"سمندری بلا ختم ہو گئی ہے ـــــ اب ہم ہمیشہ کے لیے اس سے نجات پا گئے ہیں!"

اتنی بات سُنتے ہی تمام لوگ سمندر کے ساحل کی طرف دوڑے جہاں ان کا سب سے بڑا دشمن مردہ صورت میں پڑا تھا جس نے ایک عرصہ سے ان کی زندگی برباد کر رکھی تھی وہ خوف ناک بلا اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی سب اسے اپنی آنکھوں سے مردہ دیکھ رہے تھے اور شیگار کی بہادری اور جرأت کی تعریفیں کر رہے تھے۔ بوڑھے اس باپ پہ رشک کر رہے تھے جس کا وہ بیٹا تھا، نوجوان اسے اس حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ کاش یہ جرأت ان میں ہوتی، اور مائیں اپنے بچوں سے کہہ رہی تھیں کہ وہ بہادر شیگار کا نام ہمیشہ یاد رکھیں، اسی کی طرح بہادر بن کر اپنا نام روشن کریں۔ غرض کہ ہر شخص شیگار کی تعریف کر رہا تھا اور اس کا ممنون تھا سب لوگ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے۔

"اے بہادر شیگار! ہم تمھارے شکر گزار ہیں۔ تم نے ہمیں موت کے منہ سے بچایا ہے۔ ہم تمھارا شکریہ کس طرح ادا کریں ـــــ؟"

"اس میں شکریہ ادا کرنے کی کوئی بات نہیں ـــــ!"

شیگار لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"خدا کو یہی بات پسند ہے کہ اس دھرتی پہ رہنے والا ہر جان دار امن اور سکون سے زندگی گزارے۔ خدا کی اس پسند اور مرضی کی خلاف ورزی نہیں چاہیے۔"

پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"خوف ناک سمندری بلا ہلاک ہو چکی ہے ـــــ کسی جان دار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچائے ـــــ اب تم لوگ امن اور خوشی سے زندگی گزارو ـــــ تمھارا دشمن ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ تم اور تمھاری اولاد بالکل محفوظ ہے ـــــ تمھاری آبادی پھر سے بڑھ جائے گی ـــــ تمھارے مویشیوں کے پھر سے اسی طرح گلّے جمع ہو جائیں گے اور تمھارے پرندے پھر سے چہچہانے لگیں گے ـــــ اب تم سب خدا کی پسند اور مرضی کے مطابق

چین کی زندگی گزار سکو گے"

اس وقت گاؤں کے لوگ اتنے خوش تھے کہ ناچ ناچ کر دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کے لبوں پر شیگار کی بہادری کی تعریف تھی اور دلوں میں مسرت کے جذبات امڈ رہے تھے شیگار نے جب انھیں اس طرح خوش دیکھا تو سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ! ـــــ تم سب کو خدا حافظ!"

اور وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیا۔ لوگ اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی اور تشکر کی چمک تھی وہ وہاں کھڑے اس وقت تک شیگار کو جاتا دیکھتے رہے جب تک وہ نظر آتا رہا۔ اور جب وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو سب لوگ اس کی تعریفیں کرتے ہوئے واپس گاؤں کی طرف چل دیئے۔

اس کارنامے کے بعد شیگار نے دل میں سوچا۔

"مجھے اپنے گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو چکے ہیں ـــــ اب واپس گھر جانا چاہیے!"

چنانچہ وہ مشرقی سمندر کے اس جزیرے کی طرف چل دیا جہاں اس کی دونوں بیویاں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُڑنے والا گھوڑا اس کے پاس تھا اس لیے وہاں پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہ لگی۔ جزیرے میں پہنچ کر پہلے وہ اپنی ایک بیوی کے پاس گیا۔ اس کی بیوی نے ایک طویل عرصے سے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ اب جوں ہی اس نے شیگار کو اپنے سامنے دیکھا اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکی اور رونے لگی۔ مگر جب شیگار نے اسے گلے سے لگا کر تسلّی دی اور اپنے سفر کی پوری روداد سُنائی تو اس کے آنسو بند ہو گئے وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ اس کے شوہر نے لوگوں کی بھلائی کے لیے اتنا کچھ کیا ہے اس کے بہادرانہ کارنامے سُن کر اس کا غم خوشی میں بدل گیا۔ اب وہ بہت خوش تھی اور اسے شیگار کی بہادری پر فخر تھا۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی اور اس چاہت میں اتنی اندھی ہو گئی تھی کہ اس نے اپنا برا بھلا بھی نہ سوچا۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا۔

"کہیں ایسا نہ ہو، شیگار پھر مجھے چھوڑ کر کسی سفر پہ چلا جائے!"

چنانچہ رات کو جب شیگار گہری نیند سو گیا تو وہ دبے پاؤں اٹھی اور اس جگہ چلی گئی جہاں شیگار کا اڑنے والا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے خاموشی سے گھوڑے کا ایک پَر کاٹ دیا تاکہ شیگار پھر سفر پہ نہ جا سکے۔ پَر کاٹنے کے بعد وہ اسی طرح ہولے ہولے واپس آئی اور اپنے بستر پہ پڑ کے سو گئی۔

دوسری صبح شیگار بہت سویرے بیدار ہوا تاکہ وہ اپنی دوسری بیوی کے پاس جائے اور اس کا حال معلوم کرے۔ وہ بھی اس کے انتظار میں بے حال ہو رہی ہوگی۔ اس نے اٹھ کر گھوڑے کو تیار کیا اور اس پہ سوار ہو کر ایڑ لگائی۔ گھوڑے بے چارے کا ایک پَر کٹ چکا تھا اس لیے اس کے لیے پہلے کی طرح اڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب شیگار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو وہ اپنی پوری طاقت صرف کر کے اڑا۔ گو اس وقت گھوڑے کے لیے اڑنا مشکل ہو رہا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے مالک کے حکم پہ اپنی ہر امکانی کوشش کر کے اڑنے لگا۔ اور اسے اس کی دوسری بیوی کے گھر لے گیا۔ اس کی دوسری بیوی بھی اس کا انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ اس نے جوں ہی شیگار کو دیکھا، بھاگ کر اس سے لپٹ گئی اور خوشی کے جذبات پہ قابو نہ پا کر رونے لگی۔ شیگار نے اسے دلاسہ دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ خاموش ہو گئی تو اس نے اسے اپنے سفر کی پوری کہانی سنائی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ کہاں کہاں گیا، کس کس سے ملا اور کون کون سی جگہ دیکھی ــــ؟ اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح اس نے اژدہا کو مار کر پرندوں کو نجات دلائی۔ اور کس طرح خوف ناک سمندری بلا کو ہلاک کر کے گاؤں کے لوگوں کی زندگیاں بچائیں۔ شیگار کی بیوی نے جب اس کی بہادری کے قصے سنے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس خوشی میں وہ اپنے طویل انتظار کا سارا دکھ بھول گئی مگر اسے بھی یہ دھڑکا تھا کہ کہیں شیگار پھر کسی لمبے سفر پہ نہ چلا جائے ــــ چنانچہ ایک رات جب شیگار گہری نیند سویا ہوا تھا تو وہ چپکے سے اٹھی اور دبے پاؤں گھوڑے کے پاس گئی۔ اس نے نہ کچھ سوچا نہ سمجھا اور خاموشی سے گھوڑے کا دوسرا پَر بھی کاٹ دیا۔ اب وہ مطمئن تھی کہ شیگار کبھی لمبے سفر پہ نہ جا سکے گا۔ وہ کبھی

اس سے جُدا نہ ہو سکے گی۔

ادھر شیگار ان تمام باتوں سے بے خبر تھا اور اپنے دل میں نئے سفر کے ارادے باندھ رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے بھی اپنے اس ارادے کا ذکر نہ کیا اور دل ہی دل میں اپنے سفر کا دن طے کرتا رہا۔ آخر جون مہینے کی ایک چاندنی رات کو وہ خاموشی سے اٹھا۔ آج وہ خلاف معمول صبح ہونے سے بہت پہلے بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا تو اس کی بیوی گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ دبے دبے پاؤں اپنے گھوڑے کے پاس گیا اور اس پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا گھوڑا اُڑنے والا ہے، وہ اشارہ پاتے ہی ہوا ہو جائے گا مگر وہاں سب کچھ اس کے اُلٹ تھا۔ گھوڑے کے دونوں پَر کٹے ہوئے تھے اور اس صورت میں اس کا اُڑنا مشکل تھا۔ اِدھر اس نے ایڑ لگائی اور اُدھر گھوڑے نے ہوا میں چھلانگ لگائی مگر پَر نہ ہونے کی وجہ سے اُڑنے کی بجائے اس کے پاؤں فضا میں بلند ہوئے اور وہ تھوڑا سا بلند ہو کر چکریاں کھانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ درد سے بلبلا کر زور زور سے ہنہنانے لگا۔

دوسری طرف جوں ہی شیگار کی بیوی نے گھوڑے کے زور زور سے ہنہنانے کی آواز سُنی وہ نیند سے بیدار ہو گئی اور جلدی سے اُٹھ کر اس طرف بھاگی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ شیگار کے پاس پہنچتی۔ اسے پَر کٹے ہونے سے آگاہ کرتی یا کچھ کہتی، شیگار اور اس کا گھوڑا دونوں سمندر میں جا گرے تھے۔

"شیگار سمندر میں گر گیا!"

"شیگار سمندر میں گر گیا!"

چند ہی لمحوں میں یہ خبر سارے جزیرے میں پھیل گئی۔ اب ہر شخص کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ تھا۔

"شیگار سمندر میں گر گیا!"

اس خبر سے لوگوں کا جو حال تھا، وہ تو تھا ہی مگر جیسے ہی یہ خبر پرندوں اور جانوروں تک پہنچی ان کے غم کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ لوگ جوق در جوق سمندر کے کنارے

جمع ہونے لگے ۔ ہر ایک غم میں ڈوبا ہوا تھا ۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ ہر شخص غم میں نڈھال حیرت سے سمندر کے پانی پر نظریں جمائے ہوئے جہاں اُچھلتی کودتی لہروں کے سوا کچھ نہ تھا ۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا ——؟ کیسے ہوا ——؟ کیوں ہوا ——؟ اس کے ساتھ ہی بے شمار پرندے غول کے غول فضا میں جمع ہونے لگے اور بہادر شیگار کے غم میں چیخنے چلّانے لگے —— اَن گِنت پرندے فضا میں پرواز کرتے ہوئے سوگ میں ڈوبی ہوئی آوازوں میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے ۔

" اے سمندر! ہمارا بہادر شیگار ہمیں واپس دے دو ——! "

" ہمارا شیگار ہمیں واپس دے دو ——! "

مگر پرندوں کی ان ہزاروں آوازوں کے جواب میں صرف سمندر کی وہ تیز و تند لہریں تھیں جو بار بار اُچھل رہی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ ان میں اور جوش پیدا ہوتا جا رہا تھا ۔ قسم قسم کے یہ بے شمار پرندے بڑی دیر تک فضا میں پرواز کرتے ہوئے چیختے رہے —— اور پھر تھک ہار کر ، گردنیں لٹکائے اُڑتے ہوئے غائب ہو گئے ۔

اس واقعہ کو صدیاں بیت چکی ہیں مگر پرندوں کو اب بھی پوری اُمید ہے کہ ان کا بہادر شیگار ایک بار پھر واپس آئے گا ۔ ہر سال جون کے مہینے میں اس بلند ہموار میدان میں کوئی ایک پرندہ بھی دکھائی نہیں دیتا جہاں شیگار نے اژدہا کو ہلاک کیا تھا ۔ اس مہینے میں تمام پرندے اسی جزیرے میں سمندر کے کنارے پہ پہنچ جاتے ہیں جہاں شیگار اور اس کا گھوڑا سمندر میں گرے تھے ۔ اس طرح یہ پرندے ہر سال یہاں جمع ہوتے ہیں اور پکار پکار کر سمندر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ۔

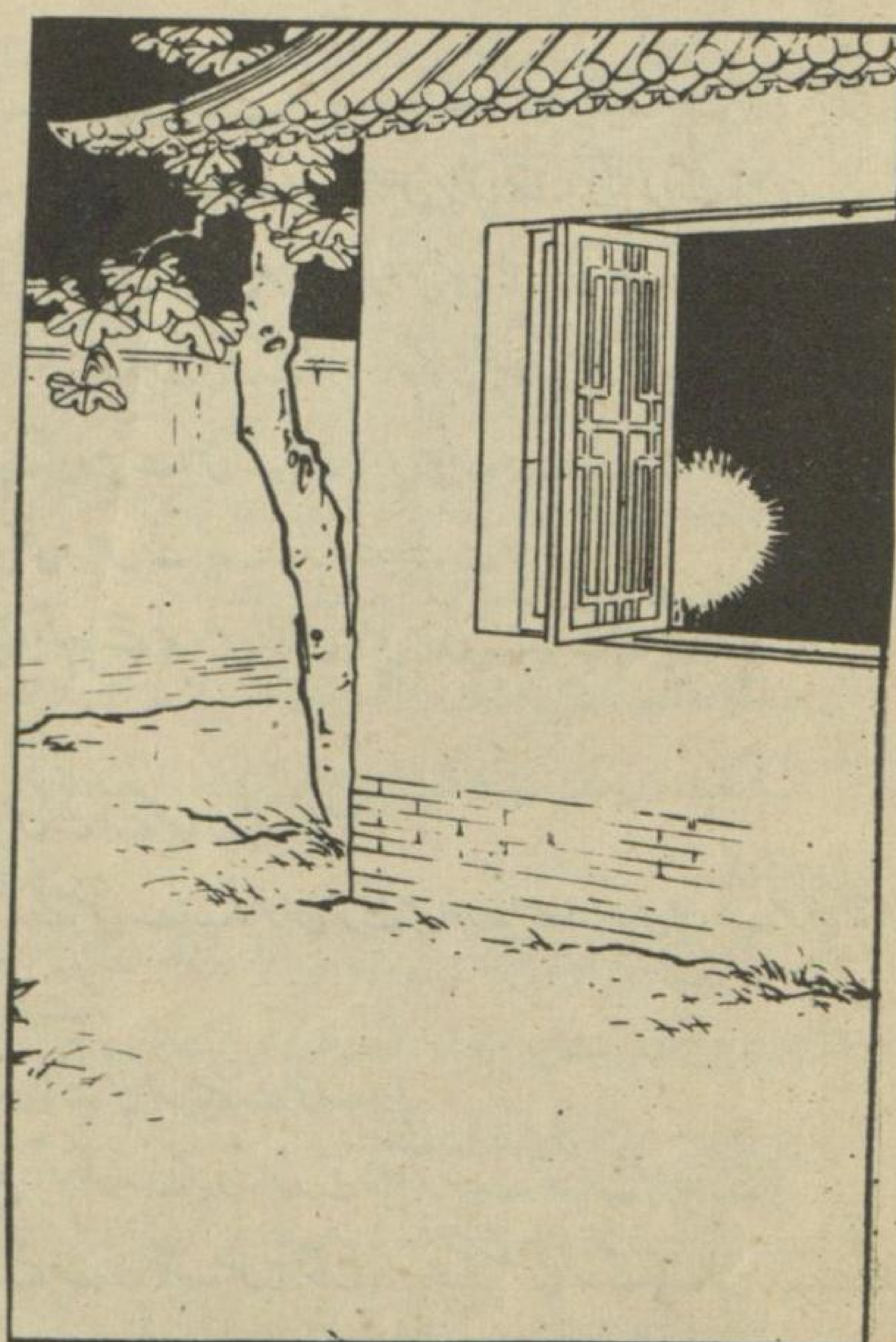
" اے سمندر! ہمارا بہادر شیگار ہمیں واپس دے دو ——! "

" ہمارا بہادر شیگار ہمیں واپس دے دو ——! "

جواب میں سمندر کی تیز و تند لہریں اسی طرح مسلسل جوش و خروش میں اُچھل اُچھل کر فضا میں بلند ہوتی رہتی ہیں —— اور انھوں نے آج تک پرندوں کو کوئی جواب نہیں دیا۔

جھیل کا پانی

OLIVE LAKE



پُرانے وقتوں کی بات ہے۔ اوبوے پہاڑ کے دامن میں ایک بہت بڑی جھیل تھی اور پہاڑ کے نام ہی کی وجہ سے اس کا نام بھی اوبوے جھیل پڑ گیا تھا۔ اس جھیل کے پاس ہی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں ایک بوڑھی عورت اور اس کا بیٹا رہتے تھے۔ وہ بہت غریب تھے۔ بے چاری بڑھیا محنت مزدوری کر کے گھر کا کام کاج چلا رہی تھی مگر اب وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں جواب دے چکے تھے اور اب وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک روز اپنے بیٹے سے کہا۔

"بیٹا! تم جانتے ہو، میں بوڑھی ہو چکی ہوں — اب مجھ میں کام کرنے کی ہمت نہیں رہی"۔

پھر اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اللہ کے فضل سے اب تم جوان ہو چکے ہو اور میرا سہارا تم ہی ہو۔ اب جو کچھ کرنا ہے تمہیں کو کرنا ہے"۔

ماں کی بات سُن کر بیٹے نے جواب دیا۔

"ماں! تم فکر مت کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

بیٹے نے چند روز تک سوچ بچار کی اور پھر کوشش کر کے ایک زمیندار سے زمین کا ایک ٹکڑا کرائے پہ حاصل کر لیا۔ ماں اور بیٹا دونوں بہت خوش تھے کہ اب بہت جلد ان کے

دن پھر جائیں گے اور وہ سکھ کی زندگی گزارنے لگیں گے۔ لڑکے نے زمین کو گاہنے بونے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ بڑی محنت اور مشقت سے کاشت کاری میں لگ گیا۔ دن رات ایک کر کے کام کرتا رہا مگر جب اس کا نتیجہ سامنے آیا تو ماں بیٹوں کو بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اتنی محنت کے بعد بھی ان کے حالات بدلنے کی کوئی امید پیدا نہ ہو سکی۔ انھیں آئندہ فصل تک نہ کھانے پینے کے لیے کافی اناج حاصل ہو سکا اور نہ کپڑے لتّے کے لیے پیسے حاصل ہوئے جس طرح کھیتی باڑی کرنے سے پہلے ان کی حالت تھی، اب اس سے بھی زیادہ خراب ہو گئی تھی اس نے سال بھر اس زمین پہ محنت کی مگر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ نوجوان اپنی جگہ بہت حیران تھا اور اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ۔

"ادبورے جھیل کا پانی ہر وقت ہلتا کیوں رہتا ہے —؟ یہ ساکت کیوں نہیں ہوتا؟ آخر اس میں کیا راز ہے —؟"

پھر اس نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"اس جھیل کی حالت بھی میری طرح نہیں بدلتی — اس میں ہر وقت لہریں اٹھتی رہتی ہیں اور اس کے باوجود اس کا پانی گدلا رہتا ہے۔ اسی طرح میری حالت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی — میں نے دن رات ایک کر کے اس قدر محنت کی لیکن میری حالت پھر بھی ویسی کی ویسی ہے — میں غریب کا غریب ہوں — آخر ایسا کیوں ہے —؟"

وہ کئی روز تک اس الجھن میں گرفتار رہا اور اپنے طور پہ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے اس مسئلے کے ہر پہلو پہ غور کیا مگر اس کے دل کو تسلی نہ ہوئی وہ بار بار یہی سوچتا رہا۔

"ادبورے جھیل کا پانی ہمیشہ گدلا کیوں رہتا ہے اور میری محنت پھل کیوں نہیں لاتی؟"

وہ اس سلسلے میں لوگوں سے بھی پوچھتا۔ لوگ طرح طرح کے جواب دیتے مگر اسے کوئی مطمئن نہ کر سکا۔ اسی دوران میں کسی نے اسے بتایا کہ۔

"اگر کوئی آدمی کسی ایسی الجھن میں گرفتار ہو جس کا کوئی حل نہ ملتا ہو — یا کوئی شخص کسی مصیبت میں پھنسا ہو تو اسے مغرب کے دیوتا کے پاس جا کر مشورہ کرنا چاہیے — اس

کے مشورے پر عمل کرنے سے اس کی الجھن اور مصیبت دور ہو جائے گی"

نوجوان نے جب یہ سُنا تو اس نے اپنے آپ سے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے بھی مغرب کے دیوتا کے پاس جانا چاہیے — یقیناً وہ اس راز سے پردہ اٹھا دے گا۔ صرف اسی طرح اس کی غریبی اور مفلسی دُور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے پکّا ارادہ کرتے ہوئے خود سے کہا۔

"میں مغرب کے دیوتا کے پاس ضرور جاؤں گا اور اس سے اپنے سوال کا جواب حاصل کروں گا"

وہ اس کام میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ جلد سے جلد مغرب کے دیوتا کے پاس پہنچ جائے اور اپنے سوال کا جواب حاصل کرے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنی ماں سے کہا۔

"ماں! تم جانتی ہو میں نے زمین پر کس قدر محنت کی ہے مگر ہمارے حالات پھر بھی جوں کے توں ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی!"

جواب میں ماں افسوس اور حسرت کے لہجے میں بولی۔

"ہاں بیٹا! — شاید ہمارے مقدّر میں یہی کچھ لکھا ہے"

ماں تو مقدّر کا لکھا کہہ کر مطمئن ہو سکتی تھی مگر نوجوان کے لیے یہ جواب کافی نہیں تھا وہ تو ہر صورت میں اس کا تسلّی بخش جواب چاہتا تھا — لہٰذا اس نے ماں سے کہا۔

"ماں! مجھے اجازت دو تاکہ میں مغرب کے دیوتا کے پاس جاؤں — اور اس سے یہ معلوم کر کے آؤں کہ ہماری محنت کا ثمر کیوں نہیں ملتا —؟ ہمارے دن کیوں نہیں پھرتے؟"

بیٹے کے سفر کا سُن کر بڑھیا پریشان ہو گئی۔ اس نے منت کے لہجے میں کہا۔

"بیٹا! میں بوڑھی ہو چکی ہوں — نہ جانے کتنے دن اور زندہ رہوں — تم ہی تو میرا ایک سہارا ہو اور اب تم بھی سفر پہ جا رہے ہو —؟"

اس پر بیٹے نے ماں کو سمجھایا مجھے یہ ضرور معلوم کرنا چاہیے کہ ہمیں ہماری محنت کا پھل کیوں نہیں ملتا ورنہ ہماری حالت کبھی نہ سدھرے گی — پھر اس نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو ماں ــــ میں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔"

بڑھیا کو مجبوراً بیٹے کی بات ماننا پڑی ــــ نوجوان نے اپنی ماں کے لیے گھر میں ایندھن، چاول، تیل اور نمک وغیرہ کا اتنا ذخیرہ کر دیا جس سے وہ کافی عرصے تک گزر بسر کر سکے اور اسے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اس کے بعد اس نے ماں کی دعائیں لیں، اسے خدا حافظ کہا اور دوسری صبح اپنے سفر پہ روانہ ہو گیا۔

وہ گھر سے نکل کر مغرب کی سمت چل دیا۔ وہ دن بھر چلتا رہتا۔ بھوک پیاس لگتی تو کچھ کھا پی کر پھر سے تازہ دم ہو جاتا اور از سر نو اپنے سفر پہ چل دیتا۔ جب رات ہوتی اور تھک کر نڈھال ہو جاتا تو کہیں پڑ کے آرام کر لیتا۔ صبح ہوتی تو پھر سے اس کے نئے سفر کا آغاز ہو جاتا۔

اسی طرح وہ سات دن اور سات راتیں مسلسل سفر کرتا رہا ــــ ساتویں روز وہ مغرب کے رُخ پہ چلا جا رہا تھا کہ اسے شدت کی پیاس لگی۔ شام ہونے کو آئی تھی اور کوئی گاؤں قریب دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ وہ قدم بڑھاتا ہوا اس جھونپڑی کے پاس جا پہنچا۔ اس نے لمحہ بھر کو ادھر ادھر کا جائزہ لیا اور پھر آگے بڑھ کر جھونپڑی کے دروازے پہ دستک دے دی ــــ اس کا دستک دینا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت باہر آئی۔ اس نے نوجوان کو دیکھ کر پوچھا۔

"تم کون ہو ــــ؟ اور کیا چاہتے ہو ــــ؟"

"میں ایک مسافر ہوں اور پیاسا ہوں ــــ ازراہِ کرم مجھے پینے کے لیے تھوڑا سا پانی عنایت کر دیجیے ــــ!"

اس کے سوکھے حلق سے پیاس کی شدت سے خشک زبان چپکی جا رہی تھی۔

"اندر آجاؤ بیٹا!"

بوڑھی عورت نے مسکراتے ہوئے اسے اندر آنے کی دعوت دی اور وہ جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ عورت نے اسے پانی پیش کیا اور بڑی شفقت کا برتاؤ کیا۔ نوجوان ایک تو شدید پیاسا تھا اور دوسرا اسے اگلے سفر کی جلدی تھی اس لیے وہ جلدی جلدی پانی پینے لگا۔ یہ دیکھ کر بڑھیا اس سے پوچھنے لگی۔

"اے نوجوان! تم اس قدر ہانپ کیوں رہے ہو ـــــ؟ کہاں سے آئے اور تمھیں کہاں جانے کی اتنی جلدی ہے ـــــ؟"

"اے مہربان عورت! تم پوچھ کر کیا کرو گی ـــــ؟ میں ایک مصیبت کا مارا ہوں اور ایک لمبے سفر پر جا رہا ہوں!"

نوجوان نے قدرے مایوسی کے لہجے میں کہا۔ اس پر وہ عورت اسے تسلی دینے کے انداز میں بولی۔

"مجھے بھی تو بتاؤ۔ آخر وہ کیا مصیبت ہے جس نے تمھیں یہ سفر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے ـــــ؟"

نوجوان اسے بتانا نہیں چاہتا تھا مگر بڑھیا جس شفقت اور خلوص سے اس کے ساتھ پیش آئی تھی، اس نے سب کچھ بتانے پر مجبور کر دیا۔

"میں مغرب کی جنت کی طرف جا رہا ہوں!"

نوجوان نے جواب دیا اور پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"میں وہاں پہنچ کر مغرب کے دیوتا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اوسیوے جھیل کا پانی ساکت کیوں نہیں ہوتا ـــــ وہ ہر وقت ہلتا اور لہریں لیتا رہتا ہے مگر اس کے باوجود گدلا کیوں رہتا ہے ـــــ؟ میں اس سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ میں سال بھر محنت مشقت کرنے کے باوجود غریب کیوں ہوں ـــــ؟ مجھے میری محنت کا ثمر کیوں نہیں ملتا ـــــ؟"

جوں ہی بوڑھی عورت نے اس کی یہ بات سُنی، اس کے چہرے پر جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی ـــــ وہ جلدی سے کہنے لگی۔

"اے نوجوان! خدا تمھیں تمھارے مقصد میں کامیاب کرے ـــــ کیا تم وہاں جا کر میرا بھی ایک کام کرو گے ـــــ؟"

"وہ کیا کام ہے ـــــ؟ اگر میں کر سکا تو ضرور کروں گا ـــــ؟"

نوجوان نے جواب دیا جس پر عورت نے کہا۔

"میری ایک بیٹی ہے جس کی عمر اٹھارہ سال ہو چکی ہے۔ وہ بہت خوب صورت اور ہوشیار ہے لیکن وہ جب سے پیدا ہوئی ہے اس وقت سے آج تک اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔ اس نے یہ اٹھارہ سال خاموشی میں گزار دیئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ قدرے التجا کے انداز میں کہنے لگی۔

"کیا تم مغرب کے دیوتا سے یہ پوچھو گے کہ وہ بات کیوں نہیں کرتی ——؟"

"میں ضرور اس کی وجہ دریافت کروں گا —— تم فکر نہ کرو!"

نوجوان نے اسے تسلی دی اور وہ رات اس نے بڑھیا کی جھونپڑی میں گزاری۔ دوسری صبح اس نے بڑھیا کا شکریہ ادا کیا، اسے خدا حافظ کہا اور پھر مغرب کی سمت اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو گیا۔ پہلے کی طرح وہ پھر دن بھر سفر کرتا اور جب رات ہو جاتی تو کہیں رات بسر کر لیتا۔ دوسری صبح بیدار ہوتا اور اپنی منزل کی طرف چل دیتا —— اسی طرح وہ سات دن اور سات راتیں مغرب کی طرف سفر کرتا رہا —— ساتویں روز وہ نڈھال ہو چکا تھا مگر پھر بھی ہمت کر کے آگے بڑھتا رہا —— جب دن ڈھل گیا اور چاروں طرف شام کے اندھیرے پھیل گئے تو اس کے لیے اپنا سفر جاری رکھنا مشکل ہو گیا —— وہ رات بسر کرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ تلاش کرنے لگا۔ اس نے دیکھا تو قریب ہی ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ اس نے دل میں سوچا۔

"چلو —— یہیں رات بسر کر لیتا ہوں!"

وہ جھونپڑی کے پاس گیا تو دیکھا، دروازہ بند تھا —— اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی تو چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا شخص باہر آیا —— وہ ایک اجنبی نوجوان کو وہاں دیکھ کر تعجب سے پوچھنے لگا۔

"اے نوجوان! تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو ——؟"

جواب میں نوجوان نے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایک مسافر ہوں —— سفر سے تھک چکا ہوں اور رات بسر کرنا چاہتا ہوں —!"

بوڑھے نے ایک نظر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پُرخلوص لہجے میں بولا۔

"اندر آ جاؤ!"

نوجوان جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ بوڑھے نے اسے بڑی عزت سے بٹھایا اور جو کچھ گھر میں پکا ہوا تھا اسے پیش کر دیا۔ جب وہ کھانا کھا کر تھوڑا سستا چکا تو بوڑھے نے دریافت کیا

"اے نوجوان! تم کہاں جا رہے ہو —؟ تم پسینے میں تر بتر ہو، آخر تمھیں اتنی جلدی کیوں ہے —؟"

جواب میں اس نے کہا

"میں مغرب کی جنت کی طرف جا رہا ہوں!"

پھر اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

"میں وہاں پہنچ کر مغرب کے دیوتا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اولیوے جھیل کا پانی ساکت کیوں نہیں ہوتا —؟ وہ ہر وقت ہلتا اور لہریں لیتا رہتا ہے مگر اس کے باوجود گدلا کیوں رہتا ہے —؟ میں اس سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ میں سال بھر محنت مشقت کرنے کے باوجود غریب کیوں ہوں —؟ مجھے میری محنت کا ثمر کیوں نہیں ملتا —؟"

جوں ہی اس نے اپنی بات ختم کی بوڑھے نے ایک قہقہہ لگایا اور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"کتنی خوش قسمتی کی بات!"

پھر اس نے نوجوان سے پوچھا۔

"کیا تم مغرب کے دیوتا سے میرے ایک سوال کا جواب بھی دریافت کرو گے —؟"

"کیوں نہیں — میں ضرور پوچھوں گا — تم مجھے اپنا سوال بتاؤ —؟"

نوجوان کے ہامی بھرنے پر بوڑھا کہنے لگا۔

"میرے باغ میں ایک سنترے کا پیڑ ہے — یہ پیڑ پتّوں سے لدا پھدا رہتا ہے مگر پھر بھی اسے سنترے نہیں لگتے — تم مغرب کے دیوتا سے دریافت کرنا کہ میرے درخت کو پھل کیوں نہیں لگتا —؟"

"میں تمھارے سوال کا جواب ضرور پوچھوں گا — اگر میں نے اس کا سبب معلوم کر لیا تو مجھے خوشی ہو گی"

نوجوان نے بوڑھے سے وعدہ کیا اور وہ رات اس نے وہیں بسر کی۔ دوسری صبح اس نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا۔ اسے خدا حافظ کہا اور پھر سے مغرب کی سمت اپنے سفر پہ روانہ ہو گیا۔

وہ منزلوں پہ منزلیں طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ راستے میں دریا آ گیا۔ یہ دریا بہت بڑے پاٹ کا اور بڑا پُر شور تھا۔ نہ اس پہ کوئی پُل تھا اور نہ وہاں کوئی کشتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ دیکھ کر نوجوان وہاں رُک گیا۔

"اسے کیسے پار کیا جائے ــــ؟"

وہ اپنے دل میں سوچنے لگا ــــ وہ تھوڑی دیر تک اسی کشمکش و پیچ میں پڑا رہا۔ بے مقصد اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا ــــ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا تو وہ مایوس سا ہو کر دریا کے کنارے پڑے ہوئے ایک پتّھر پہ بیٹھ گیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر تک حیران و پریشان وہاں بیٹھا رہا کہ اتنے میں اچانک آسمان پہ آندھی کا طوفان اُٹھا ــــ یہ آندھی اس قدر تیز، خوف ناک اور سیاہ تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری فضا اندھی ہو گئی ــــ چاروں طرف اندھیرا سا پھیل گیا۔ اس آندھی کے ساتھ ہی دریا میں بھی طوفان آ گیا ــــ پُر شور لہریں اُچھل اُچھل کر کناروں سے باہر آنے لگیں اور سارے دریا میں ہل چل سی مچ گئی ــــ یہ دیکھ کر نوجوان اور بھی پریشان اور خوف زدہ ہو گیا۔

"یا الٰہی! یہ کیسی مصیبت ہے ــــ؟ تُو ہی میری مدد کرنے والا ہے!"

اس نے دل ہی دل میں دُعا مانگی اور حیران و پریشان بیٹھا رہا ــــ تھوڑی دیر تک یہی عالم رہا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ طوفان تھم گیا۔ فضا اور آسمان صاف ہو گئے۔ دریا کے پانی میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ــــ پھر نوجوان نے دیکھا کہ چند ہی لمحوں کے اندر اندر آسمان پر خوب صورت اور رنگین بادل چھا گئے۔ ساری فضا پُر سکون تھی جس میں بادلوں کے خوب صورت رنگ بکھر رہے تھے۔ یہ تبدیلی اس کے لیے اور بھی تعجب کا باعث تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے ــــ؟ یہ طوفان کیوں آیا اور پھر یہ آسمان پر خوب صورت رنگین بادل کہاں سے آ گئے ــــ؟ وہ ابھی اسی اُلجھن میں گرفتار تھا کہ اتنے میں دریا کے پانی میں سے ایک بہت بڑا

اژدہا اوپر آیا۔ اس نے پہلے نوجوان کو ٹکٹکی لگا کر دیکھا اور پھر اسے مخاطب کر کے بولا۔

"اے نوجوان! تم اس قدر مایوس کیوں بیٹھے ہو ـــــ؟"

نوجوان اس کا جواب دینے ہی والا تھا کہ وہ پھر بول پڑا۔

"کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ کہاں جا رہے ہو ـــــ؟ تمھیں اپنے سفر کی اتنی جلدی کیوں ہے ـــ؟"

جواب میں نوجوان نے اژدہا کو وہی بات بتائی جو اس سے پہلے بڑھیا اور بوڑھے سے کہی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں مغرب کی جنت کی طرف جا رہا ہوں!"

پھر اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

"میں وہاں پہنچ کر مغرب کے دیوتا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اولیوے جھیل کا پانی صاف کیوں نہیں ہوتا ـــــ؟ وہ ہر وقت ہلتا اور لہریں لیتا رہتا ہے مگر اس کے باوجود گدلا کیوں رہتا ہے ـــــ؟ میں اس سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ میں سال بھر محنت مشقت کرنے کے باوجود غریب کیوں ہوں ـــ؟ مجھے میری محنت کا ثمر کیوں نہیں ملتا ـــ؟"

اژدہا نے اس کی بات سنی تو خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"پھر تو تم میرا بھی ایک سوال پوچھ سکتے ہو ـــ کیا تم مجھ پر یہ احسان کرو گے ـــ؟ میں تمھارا ممنون ہوں گا؟"

"مجھے بتاؤ تمھارا سوال کیا ہے ـــ؟ میں مغرب کے دیوتا سے اس کا جواب ضرور دریافت کروں گا۔"

نوجوان کے اتنا کہنے پر اژدہا نے اسے بتایا۔

"میں کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا ـــ انسان ہو یا جانور میری ذات سے کسی کو دکھ نہیں پہنچتا ـــ اس کے باوجود میں ہزاروں سال سے یہاں پڑا اپنے آپ کو سزا دے رہا ہوں ـــ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر میں آسمانی جنت میں کیوں نہیں پہنچ سکتا ـــ؟"

"تم اطمینان رکھو ـــ میں تمھارے سوال کا جواب ضرور دریافت کروں گا۔"

نوجوان نے اژدہا سے وعدہ کیا ——— اس پر اژدہا بولا ۔

"آؤ میری پیٹھ پہ بیٹھ جاؤ ——— میں تمھیں دریا پار کرا دیتا ہوں ——— !"

چنانچہ نوجوان اژدہا کی پیٹھ پہ بیٹھ گیا اور اژدہا نے اسے دریا پار کرا دیا۔ دریا کے پار اُترنے پہ اس نے اژدہا کا شکریہ ادا کیا، اسے خدا حافظ کہا اور اپنے اگلے سفر پہ چل دیا۔

اژدہا سے رخصت ہونے کے بعد وہ دن بھر مسلسل چلتا رہا ——— پھر وہ ایک بہت بڑے اور قدیم شہر کے پاس پہنچ گیا۔ اس شہر میں ایک خوب صورت اور عظیم الشان محل تھا۔ وہ شہر کے دروازے پہ جا کر رُک گیا اور پہرے داروں سے پوچھا۔

"مغرب کا دیوتا کہاں رہتا ہے ——— ؟ مجھے صرف اس سے ملنا ہے ——— ؟"

جواب میں پہرے داروں نے دریافت کیا۔

"تم کون ہو ——— کہاں سے آئے ہو ——— اور مغرب کے دیوتا سے کیوں ملنا چاہتے ہو ——— ؟"

اس نے انھیں بتایا۔

"میں ایک اجنبی ہوں اور بڑی دُور سے سفر کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں ——— مجھے مغرب کے دیوتا سے اپنے سوالوں کے جوابات حاصل کرنے ہیں ——— ؟"

پہرے داروں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور شہر میں لے گئے۔ پھر اسے اس عظیم الشان شاہی محل میں لے جایا گیا جو شہر کے عین درمیان میں واقع تھا۔ یہ محل بہت بڑا تھا اور اس وقت جس جگہ نوجوان کھڑا تھا وہ محل کا عالی شان دربار ہال تھا جس کی شان و شوکت دیکھ کر وہ دنگ ہو رہا تھا۔ اس شان دار ہال کے عین درمیان ایک خوب صورت چمکتا ہوا تخت بچھا تھا جس پہ ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پہ نور برس رہا تھا اور اس کے سر اور داڑھی کے لمبے لمبے سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ بوڑھا جہاں بیٹھا ہوا تھا، وہاں چاروں طرف روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

"یقیناً یہی مغرب کا دیوتا ہے ——— ؟!"

اس نے اپنے دل ہی دل میں سوچا ——— پھر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور اس

نے قریب جا کر اس بزرگ صورت شخص کو جھک کر سلام کیا۔ ابھی وہ زبان سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بوڑھے آدمی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور شفقت بھری آواز میں کہا۔

" اے نوجوان! تم یہاں کس غرض سے آئے ہو ۔۔۔۔؟"

نوجوان نے بڑے ادب سے جھک کر عرض کیا۔

" اے مغرب کے دیوتا ۔۔۔۔ میں دور دراز کا سفر کر کے یہاں پہنچا ہوں!"

بوڑھا آدمی پھر مسکرایا اور بڑے نرم لہجے میں بولا۔

"ہمیں بتاؤ تم اس قدر طویل سفر کر کے یہاں کس لیے آئے ہو ۔۔۔؟"

نوجوان نے پھر اسی طرح احترام سے عرض کیا۔

" میرے چار سوال ہیں جن کے جواب کے لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں ۔۔۔۔ مجھے ان چاروں سوالوں کے جواب درکار ہیں تاکہ میرے سفر کا مقصد پورا ہو ۔۔۔۔؟"

مغرب کے دیوتا نے اس کی درخواست قبول کر لی مگر ساتھ ہی یہ کہا۔

" اے نوجوان! ہمارا اصول یہ ہے کہ ہم صرف طاق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ۔۔۔۔ تم ایک سوال کا جواب پوچھ سکتے ہو دو کا نہیں ۔۔۔۔ تین سوال کر سکتے ہو چار نہیں ۔۔۔ اس طرح تم صرف طاق سوالوں کا جواب پوچھ سکو گے جفت کا نہیں۔"

اتنا کہہ کر مغرب کے دیوتا نے بڑے غور سے اس کا جائزہ لیا اور پھر کہا۔

" تمھارے چار سوال ہیں اور ہم صرف تین کے جواب دے سکتے ہیں ۔۔۔۔ اب یہ فیصلہ تم خود کر لو کہ کون سا سوال تمھیں چھوڑنا ہے اور کون سے تین دریافت کرنے ہیں ۔۔۔؟"

مغرب کے دیوتا کی بات سُن کر نوجوان بڑے شش و پنج میں پڑ گیا ۔۔۔ اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون سا سوال چھوڑے اور کون سا پوچھے ۔۔۔؟ وہ بار بار غور کرتا، بار بار سوچتا مگر ہر بار اُلجھ کر رہ جاتا ۔۔۔۔ اس کا اپنا سوال بڑا اہم تھا۔ اس کے لیے اس نے اتنا طویل سفر اختیار کیا تھا اور اسی پر اس کی اور اس کی ماں کی زندگی کا دارومدار تھا ۔۔۔۔ اب اگر وہ اپنا سوال نہ پوچھے تو اس کے آنے کا مقصد کیا تھا ۔۔۔؟ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ باقی تین سوال بھی اس کے لیے کم اہمیت نہ رکھتے تھے ۔۔۔۔ بڑھیا کا سوال بھی ضروری تھا کہ

اس کی بیٹی بات کیوں نہیں کرتی ——؟ بوڑھے کا سوال بھی اہم تھا کہ اس کے ہرے بھرے سنترے کے پیڑ کو پھل کیوں نہیں لگتا ——! اور اژدہا کا سوال بھی وہ نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، پھر آسمانی جنت میں کیوں نہیں جا سکتا ——؟ اگر وہ ان تینوں میں سے کسی ایک کا سوال چھوڑ کر باقی دو کا دریافت کر لیتا تو یہ بھی غلط تھا —— یا تو وہ تینوں کے سوالات کے جواب حاصل کرے یا پھر کسی ایک کا بھی نہ پوچھے —— اور یہ بات اس کے نزدیک غلط تھی کیونکہ اس نے ان سے وعدہ کیا تھا اور وہ اپنے وعدے کا سچا اور پکا تھا۔ وہ کافی دیر اسی سوچ بچار میں اُلجھا رہا اور آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنا سوال چھوڑ کر ان تین سوالوں کے جواب پوچھے جن کے لیے اس نے عہد دیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا سوال نظر انداز کر دیا اور باقی تین سوالات دریافت کیے —— مغرب کے دیوتا نے اسے تینوں سوالوں کے جوابات دے دیئے اور نوجوان دیوتا سے رخصت لے کر محل سے نکل آیا۔ وہ شہر سے باہر آیا اور اپنے واپسی سفر پر روانہ ہو گیا نوجوان بہت خوش تھا۔ اس نے تینوں سوالوں کے جوابات حاصل کر لیے تھے۔ اب وہ جلد سے جلد واپس جا کر اژدہا، بوڑھے اور بڑھیا کو ان کے جواب بتانا چاہتا تھا شہر سے دریا تک کا سفر ایک دن کا تھا جو اس نے اس سے بھی کم وقت میں طے کر لیا —— جب وہ دریا کے کنارے پر پہنچا تو اس نے دیکھا، اژدہا پہلے ہی سے اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ جوں ہی اس نے نوجوان کو دیکھا خوش ہو کر جلدی سے پوچھنے لگا۔

"اے نیک دل نوجوان! کیا تم میرے سوال کا جواب لائے ہو ——؟"

"ہاں ——! میں نے تمہارے سوال کا جواب حاصل کر لیا ہے!"

نوجوان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ اس پر اژدہا بڑی بے تابی سے بولا۔

"جلدی کرو —— پہلے مجھے میرے سوال کا جواب بتاؤ ——؟"

"مغرب کے دیوتا نے بتایا ہے کہ جب تک تم دو اچھے کام نہیں کرو گے اس وقت تک تم آسمانی جنت میں نہیں جا سکتے!"

"وہ کام کیا ہیں ——؟ مجھے جلدی بتاؤ ——؟ میں ضرور کروں گا ——؟"

اژدہا اور بھی بے صبری سے بولا جس پر نوجوان کہنے لگا۔

"پہلا کام تو یہ ہے کہ مجھے اپنی پیٹھ پہ سوار کر کے دریا پار کرا دو ـــــ اور دوسرا اچھا کام یہ ہے کہ تمھارے سر میں ایک قیمتی موتی ہے جو رات کو چمکتا ہے، اسے نکال باہر کرو!"

اژدہے نے یہ سنتے ہی اسی وقت نوجوان کو اپنی پیٹھ پہ بٹھایا اور دریا کے پار لے گیا ـــــ جب وہ دوسرے کنارے پہ پہنچ گئے تو اس نے نوجوان سے کہا۔

"اب وہ موتی نکالنے میں میری مدد کرو!"

اژدہا نے اپنے سر کو زور زور سے جھٹکے دیئے اور نوجوان نے بھی اس کی مدد کی ـــــ اور پھر انھوں نے دیکھا کہ اژدہا کے سر سے ایک قیمتی موتی نکل کر باہر آ گرا ـــــ موتی کا باہر آنا تھا کہ اس کے ساتھ ہی اژدہا فضا میں بلند ہونے لگا ـــــ وہ آسمانی جنت میں جا رہا تھا۔ جب وہ فضا میں بادلوں کو چیرتا ہوا اوپر جا رہا تھا تو اس نے نیچے کھڑے نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے نیک دل نوجوان! یہ قیمتی موتی میری طرف سے تمھارے لیے تحفہ ہے!"

اژدہا نے اتنا کہا اور بادلوں کو چیرتا ہوا آسمان کی طرف جاتے ہوئے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ نوجوان چند لمحوں تک اس حیرت ناک منظر میں کھویا رہا۔ پھر اس نے وہ قیمتی موتی سنبھالا اور اپنے واپسی سفر پہ چل دیا۔

وہ دن رات سفر کرتا رہا۔ منزلوں پہ منزلیں طے ہوتی رہیں۔ اس نے نہ اپنی تکان کا خیال کیا اور نہ بھوک پیاس کو خاطر میں لایا۔ یہاں تک کہ وہ اس بوڑھے کی جھونپڑی پہ پہنچ گیا جہاں اس نے آتے وقت ایک رات بسر کی تھی۔ ادھر بوڑھے نے جوں ہی نوجوان کو دیکھا خوشی سے اچھل پڑا۔

"کیا تم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ـــــ؟ کیا تم میرے سوال کا جواب لائے ہو ـــــ؟"

"ہاں ـــــ! میں تمھارے سوال کا جواب لایا ہوں!"

نوجوان کے اتنا کہنے پہ بوڑھا بڑی بے صبری سے پوچھنے لگا۔

"مجھے جلدی بتاؤ، مغرب کے دیوتا نے کیا جواب دیا ہے ـــــ؟"

نوجوان نے اسے بتایا۔

"مجھے مغرب کے دیوتا نے بتایا ہے کہ تمھارے باغ میں جو تالاب ہے اس کی تہہ میں سونے سے بھرے ہوئے سات جگ اور سات ہی چاندی سے بھرے ہوئے جگ دفن ہیں۔ اگر تم تالاب کی تہہ کھود کر انھیں باہر نکال دو اور اس کے بعد تالاب کا پانی سنترے کے پیڑ کو دو تو وہ پھل دینے لگے گا۔ جب تک سونے چاندی والے یہ جگ نہیں نکالے جائیں گے اس وقت تک درخت کو پھل نہیں لگ سکتا۔"

اتنی بات سنتے ہی بوڑھے نے جلدی سے اپنے بیٹے کو بلایا اور پھر ان تینوں نے مل کر تالاب کا سارا پانی باہر نکال دیا۔ پانی نکالنے کے بعد انھوں نے تالاب کی تہہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ وہ بڑی بے تابی سے تالاب کی کھدائی کر رہے تھے مگر ابھی تک انھیں کچھ نہیں مل سکا تھا۔ بوڑھا اور اس کا بیٹا قدرے مایوس ہو رہے تھے مگر نوجوان نے انھیں یقین دلایا کہ مغرب کے دیوتا کا کہا ضرور سچ ثابت ہوگا۔ سونے چاندی سے بھرے ہوئے سات سات جگ ضرور نکلیں گے —— وہ اور تن دہی سے گہری سے گہری کھدائی کرتے چلے گئے —— یہاں تک کہ اچانک انھوں نے دیکھا، سات سونے سے بھرے ہوئے جگ اور اتنے ہی چاندی سے بھرے ہوئے جگ ان کے سامنے تھے۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انھوں نے جلدی جلدی کھدائی کر کے ان کو باہر نکالا —— اور جب انھوں نے سارے جگ باہر نکال لیے تو اس کے ساتھ ہی تالاب کی تہہ میں سے صاف و شفاف پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا تالاب صاف ستھرے پانی سے کناروں تک بھر گیا۔ بوڑھے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اسی وقت تالاب کا صاف و شفاف پانی سنترے کے پیڑ کو دینا شروع کر دیا۔ جوں ہی تالاب کا پانی درخت کی جڑوں تک پہنچا اس کے ساتھ ہی درخت کی ہر شاخ سنتروں سے لد گئی —— اور یہ تمام سنترے سونے کے تھے جن کی چمک دمک سے سارا باغ جگمگا اٹھا تھا —— بوڑھا اور اس کا بیٹا یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر اس قدر خوش تھے کہ ان کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کریں اور کیا کہیں —— ؟ انھوں نے نوجوان سے درخواست کی کہ وہ دو چار روز ان کے ہاں قیام کرے اور پھر چلا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا نوجوان

ان کی خواہش کے مطابق ایک دو روز وہاں رُک گیا۔ جب وہ چلنے لگا تو بوڑھے اور اس کے بیٹے نے تحفے کے طور پر اسے بہت سا سونا چاندی دیا۔ نوجوان نے ان کا دیا ہوا سونا چاندی باندھا، انھیں خدا حافظ کہا اور پھر اپنے واپسی سفر پر چل دیا۔

اب نوجوان کے پاس اژدہا کا دیا ہوا قیمتی موتی بھی تھا اور بوڑھے کا دیا ہوا بہت سا سونا چاندی بھی ـــــ اب وہ سات دن میں ختم ہونے والا سفر جلد سے جلد طے کر کے اس بڑھیا کے گھر پہنچنا چاہتا تھا جہاں اس نے آتے میں رات بسر کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے بڑھیا کو بھی اس کے سوال کا وہ جواب بتا دے جو مغرب کے دیوتا نے اسے بتایا تھا۔ اسی دھن میں چلتا چلاتا آخر وہ وہاں پہنچ گیا جہاں بڑھیا کی جھونپڑی تھی۔ ادھر بوڑھی عورت بھی اس کی پہلے ہی سے منتظر تھی۔ جب اس نے نوجوان کو آتے دیکھا تو خوشی خوشی آگے بڑھی اور پوچھنے لگی۔

"اے نوجوان! میں نے تمھیں جو کام کہا تھا کیا تم نے میرا وہ کام کر دیا ـــــ؟"

"ہاں ـــــ! میں نے تمھارے سوال کا جواب حاصل کر لیا ہے۔"

نوجوان کے اتنا کہنے پر بڑھیا بڑی بے تابی سے بولی۔

"مجھے جلدی سے بتاؤ، مغرب کے دیوتا نے میرے سوال کا کیا جواب دیا ہے؟"

جواب میں نوجوان نے اسے بتایا۔

"مغرب کے دیوتا نے مجھے کہا ہے، میں تمھیں بتا دوں کہ تمھاری بیٹی اس وقت باتیں کرنا شروع کرے گی جب وہ اپنی پسند کے کسی نوجوان سے شادی کرے گی ـــــ جب تک تم اس کی شادی اس کی پسند کے نوجوان سے نہیں کرو گی اس وقت تک وہ اسی طرح خاموش رہے گی۔"

جب نوجوان اور بڑھیا دونوں یہ باتیں کر رہے تھے، عین اس وقت بڑھیا کی بیٹی گھر سے باہر نکل آئی ـــــ وہ اس قدر حسین و جوان تھی کہ نوجوان کو اس کی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اس کا چہرہ پھولوں کی طرح تر و تازہ اور اس کی آنکھوں میں جھیلوں کی سی گہرائی تھی۔ اس کا قد سرو کو شرمانے والا تھا اور اس کے جسم میں جیسے قوس قزح

کے رنگ بھرے ہوئے تھے ۔ جوں ہی لڑکی کی نظر نوجوان پر پڑی وہ شرم سے گلاب کے سُرخ پھول کی طرح ہوگئی ۔ اس کی نظریں دل میں اُتر جانے والی تھیں ۔ اس نے لمحہ بھر کو مسکرا کے نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر اپنی ماں سے پوچھنے لگی ۔

”ماں ــــ ! یہ نوجوان کون ہے ــــ ؟“

وہ جب سے پیدا ہوئی تھی اس وقت سے آج اس نے پہلی بار لب کھولے تھے ۔ یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے زندگی بھر میں پہلی بار ادا کیا تھا ۔ اس کی بوڑھی ماں تو جیسے خوشی میں دیوانی سی ہوئی جا رہی تھی ۔ اس کی خوشی کا اندازہ کرنا مشکل تھا ۔ برسوں کے بعد اس کی دلی تمنا پوری ہوئی تھی ۔ وہ خوشی میں اس قدر جذباتی ہو رہی تھی کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ۔ اس نے دیوانوں کی طرح آگے بڑھ کر اپنی بیٹی کو بازوؤں میں لے لیا ــــ اور اس کی بوڑھی آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہنے لگے ۔

”میری پیاری بیٹی ــــ آج خدا نے میری سب سے بڑی تمنا پوری کر دی ہے “!

وہ اپنی بیٹی کو پیار کر رہی تھی ۔ اسے بار بار چوم رہی تھی، بار بار گلے لگا رہی تھی مگر اس کے دل کو پھر بھی تسکین نہ ہوتی تھی ۔ وہ نوجوان کی بڑی شکر گزار تھی جس کی وجہ سے اس کی بیٹی نے بات کرنا شروع کی تھی ۔ وہ اس کی ایمان داری، ایثار، اور وعدے کی سچائی کی بھی قائل تھی ــــ وہ صحت مند بھی تھا، خوب صورت بھی، اور نوجوان بھی ــــ وہ یہ بھی دیکھ چکی تھی کہ بیٹی اسے دیکھ کر شرما گئی تھی، اس نے مسکرا کے اس کی طرف دیکھا تھا اور اسی کی وجہ سے پہلی بار بات کی تھی ــــ اس نے دل میں سوچا ۔

”اس نوجوان سے اچھا بَر میری بیٹی کے لیے اور کون ہو سکتا ہے ــــ ؟ پھر بیٹی کو بھی نوجوان پسند ہے اور مغرب کے دیوتا نے بھی یہی بتایا ہے ــــ اسی لیے تو اس نے نوجوان کو دیکھتے ہی بات کی ہے ــــ ؟“

یہی کچھ سوچ کر وہ بیٹی کو بڑے پیار سے کہنے لگی ۔

”پیاری بیٹی ! آج کا دن نیک شگون کا دن ہے ــــ جب سے تم پیدا ہوئی ہو اس وقت سے آج تم نے پہلی بار بات کی ہے ــــ یہ دن ہم دونوں کی زندگی کا سب سے زیادہ

پُرمسرت دن ہے ۔"

پھر اس نے بیٹی کو مشورہ دینے کے سے انداز میں کہا ۔

"میں چاہتی ہوں یہی دن تمھاری شادی کا دن ہو جائے ـــــ اور ہم اپنی خوشی میں اس نیک دل نوجوان کو بھی شریک کرلیں ـــــ یہ دن ہمیں محض اس کی وجہ سے نصیب ہوا ہے ـــــ ؟"

ماں کی بات سُن کر لڑکی شرما کے جلدی سے گھر کے اندر چلی گئی ـــــ بڑھیا نے نوجوان سے کہا ۔

" اے نوجوان ! میں تمھاری نیک دلی اور خلوص سے بہت متاثر ہوئی ہوں ـــــ میں چاہتی ہوں کہ میری بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر تم بھی میرے بیٹے بن جاؤ ـــــ ؟"

نوجوان بھلا کیا جواب دیتا ـــــ ؟ وہ تو لڑکی کو پہلی نظر دیکھتے ہی اسے دل دے بیٹھا تھا ـــــ صرف شرم اور مجبوری کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا ۔ اس نے سر جُھکا کر بڑے ادب سے جواب دیا ۔

" ماں ـــــ ! آج سے مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھو !"

چنانچہ اسی روز دونوں کی شادی کر دی گئی اور بڑھیا کی اداس جھونپڑی میں جشن کا سا سماں بندھ گیا ـــــ نوجوان چند روز تک وہاں رہا اور پھر ایک روز کہنے لگا ۔

"ماں ! اب مجھے اجازت دو ـــــ نہ جانے پیچھے میرے انتظار میں میری ماں کی کیا حالت ہوگی ـــــ ؟"

بڑھیا نے خوشی خوشی اسے جانے کی اجازت دے دی ـــــ اس طرح نوجوان قیمتی موتی ، سونا چاندی ، اور ان سب چیزوں سے کہیں زیادہ حسین و جوان بیوی ساتھ لے کر اپنے گھر کی طرف چل دیا ۔

وہ اپنی بیوی کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا ـــــ راستہ بھر اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے ـــــ کبھی وہ سوچتا ، ماں اپنی حسین بہو دیکھے گی تو کتنی خوش ہوگی ـــــ کبھی سوچتا ، جب وہ میرے پاس اتنا سارا سونا چاندی دیکھے گی تو اس کی خوشی

کا ٹھکانا نہ رہے گا — ! کبھی اپنے آپ سے کہتا، میں اس سے ایک شان دار گھر بناؤں گا، اور ہم سب زندگی بھر مزے سے رہیں گے — میری ماں کو سکھ ملے گا — ! وہ سارے سفر میں دل ہی دل میں اسی طرح کے منصوبے بناتا رہا — یہاں تک کہ اپنے گھر پہنچ گیا مگر جوں ہی اس نے گھر میں قدم رکھا اس کا دل دھک سے رہ گیا — اس کی بوڑھی ماں اس کا انتظار کرتے کرتے اندھی ہو چکی تھی — اس کی بینائی جاتی رہی تھی اور وہ بڑھاپے کی وجہ سے بے بس ہو چکی تھی — تاہم بیٹے کی واپسی سے وہ بہت خوش تھی — جب اس نے بہو کا سنا تو اور بھی خوشی میں پھولی نہ سمائی — دونوں کو بار بار گلے لگاتی اور پیار کرتی مگر وہ انھیں دیکھ نہیں سکتی تھی — اپنی خوب صورت بہو کے نرم گالوں کو چھو سکتی تھی لیکن اس کے حسن کو دیکھ نہیں سکتی تھی — نوجوان کو اس کا بڑا دکھ تھا کہ اس کی ماں بے چاری نہ تو بہو کو دیکھ سکتی ہے اور نہ اس سونے چاندی کا نظارہ کر سکتی ہے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا — وہ صرف سونے چاندی کی آواز سن سکتی تھی، اسے ہاتھوں سے چھو کر محسوس کر سکتی تھی — اور بس! لیکن اس کا بیٹا چاہتا تھا کہ اس کی ماں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے — یہ دیکھے کہ اس کا بیٹا اپنے ساتھ کیا کچھ لایا ہے۔ اس طرح اس کی خوشی دوگنی ہو جائے گی۔ اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

”ماں! کاش تم دیکھ سکتیں کہ میں تمھارے لیے کیا کچھ لایا ہوں — تم اپنی بہو کو دیکھتیں کہ وہ کس قدر حسین ہے — اس سونے چاندی کو دیکھتیں تو اور بھی حیران ہوتیں — اتنی دولت جو ہم سب کے لیے زندگی بھر کو کافی ہے۔“

اچانک نوجوان کو جیسے کچھ خیال آ گیا — اس نے جلدی سے اژدہا کا دیا ہوا چمک دار موتی نکالا اور اسے اپنی ماں کی آنکھوں کے سامنے ہلایا مگر اس کی ماں کی آنکھیں ویسی کی ویسی رہیں — وہ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں دیکھ سکتی تھی — یہ دیکھ کر نوجوان کی مایوسی اور بھی بڑھ گئی — اس نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

”کاش! میری ماں دیکھ سکتی — میری صرف یہی ایک تمنا ہے کہ میری ماں پھر

سے دیکھنے لگے۔"

اس نے ابھی یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ اس کے ساتھ ہی اس کی ماں کی بینائی لوٹ آئی — اب وہ ہر چیز دیکھ سکتی تھی۔ اپنا بیٹا، اپنی خوب صورت بہو، وہ سونا چاندی — وہ حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی — پھر خوشی میں تینوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔

نوجوان کو اب اندازہ ہوا کہ اژدہا کا دیا ہوا موتی کوئی عام موتی نہیں ہے — وہ صرف قیمتی اور رات کو روشنی دینے والا ہی نہیں بلکہ جس کے پاس ہو اس کی ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ اس نے بڑے اشتیاق سے ایک بار پھر موتی کو ہاتھ میں لے کر ہلایا اور کہا۔

"اگر ہمارے گاؤں میں کوئی امیر آدمی باقی نہ رہے تو غریب لوگ ان کے ظلم وستم کا شکار ہونے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گے — وہ سدا کے لیے جبر سے نجات پا جائیں گے!"

اس کا اتنا کہنا تھا کہ اسی لمحے گاؤں کے تمام امیر آدمی موت کی نیند سو گئے۔

وہ دن اور آج کا دن — اولیوے جھیل کا پانی ہمیشہ صاف وشفاف رہتا ہے۔ وہ پھر کبھی گدلا نہیں ہوا — اور اس گاؤں کے غریب لوگوں کی زندگی شہد سے بھی زیادہ میٹھی ہو گئی — ! یہ سب اس نوجوان کے ایثار کا نتیجہ ہے جس نے مغرب کے دیوتا کے پاس پہنچ کر اپنا سوال پوچھنے کی بجائے دوسروں کے سوال پوچھے — اس طرح اس نے اپنا عہد نبھایا اور اللہ نے اسے اس کا صلہ دے دیا۔

سَدا بہار درخت

AS EVERGREEN AS THE FIR



یہ آج سے سترہ سو برس پہلے کی بات ہے۔ صوبہ انہوائی کے ضلع لیو شینگ میں ایک نہایت خوب صورت لڑکی رہتی تھی۔ اس کے حسن کے آگے چاند شرماتا تھا اور اس کو دیکھ کر پھولوں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں جھیلوں کی سی گہرائی اور جسم میں شفق کی سی سرخیاں تھیں۔ وہ جس قدر حسین تھی اس سے کہیں زیادہ ہوشیار اور عقل مند بھی تھی۔ اس لڑکی کا نام لیو لین شی تھا۔

لین شی جب تیرہ برس کی ہوئی تو اس نے کپڑا بُننا سیکھ لیا تھا۔ اور وہ کپڑا بھی ایسا خوب صورت بُنتی تھی کہ اسے دیکھ کر بڑے بڑے ماہر دنگ رہ جاتے تھے — اس کے اپنے حسن کی طرح اس کے بُنے ہوئے کپڑے میں بھی نفاست ہوتی تھی۔

جب وہ چودہ سال کی عمر کو پہنچی تو اس نے سینے پرونے اور کڑھائی میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کے ہاتھ کی کشیدہ کاری کے آگے مشینوں کی باریکیاں ہیچ ہو کر رہ جاتی تھیں۔ پورے شہر میں شاید ہی کوئی ایسی لڑکی ہو جو اس فن میں اس کی برابری کر سکتی ہو۔

موسیقی میں لین شی کو بچپن ہی سے دل چسپی تھی — جب اس نے پندرہ برس مکمل کر لیے تو اس کے اس ذوق و شوق کے جوہر اور بھی کھل کے سامنے آئے۔ وہ ستار بجانے میں اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ مانے ہوئے فن کار بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

سولہ سال کی عمر میں لین شی نے پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ دی — پھر دن رات

محنت کر کے وہ جلد ہی اس قابل ہو گئی کہ شاعری اور نثر دونوں بخوبی پڑھ سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ جہاں تک اس کی ذہانت کا تعلق تھا سبھی لوگ اس کے قائل تھے۔

جب وہ سترہ سال کی ہوئی تو اسی علاقے کے ایک معمولی عہدے دار کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی۔ اس آدمی کا نام چیاؤ چونگ چنگ تھا اور وہ بھی لین شی کی طرح وجیہہ اور بھرپور نوجوان تھا۔ دونوں کا جوڑ بہت اچھا تھا اور دونوں ہی اپنی شادی سے بہت خوش تھے ـــــ لین شی اس لیے خوش تھی کہ اسے اپنی پسند کا شوہر مل گیا تھا اور چونگ چنگ اس بات پر نازاں تھا کہ اس کی بیوی حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین اور ہوشیار بھی ہے ـــــ وہ دونوں آپس میں بہت پیار کرتے تھے اور جی جان سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ لین شی کی ساس ایک روائتی قسم کی ساس تھی جس کا کام لڑنے جھگڑنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ انتہائی قسم کی جھگڑالو اور مغرور عورت تھی۔ بات بات پر لین شی کو ٹوکتی، اس کے ہر کام میں مین میخ نکالتی اور دن رات اس کی جان کو آئی رہتی ـــــ لین شی ایک فرماں بردار اور سعادت مند بہو کی طرح یہ سب کچھ برداشت کرتی۔ وہ ان زیادتیوں کے باوجود اپنی ساس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ اس کے کھانے پینے پر خاص طور پر توجہ دیتی اور جیسے بھی ہوتا اسے آرام اور سکھ پہنچانے کی کوشش کرتی مگر اس کی ساس تو ایک ہی تھی۔ اس کی بدمزاجی میں کوئی فرق نہ آتا۔ وہ بے چاری لین شی پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتی اور بات بات پر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔ اگر لین شی کبھی اچھے کپڑے پہن لیتی تو چمک کر کہتی۔

"تمھیں شرم نہیں آتی جو اس طرح بن ٹھن کر رہتی ہو ـــــ؟"

وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتی کہ۔

"تم تو ہمارے خاندان کی ناک کٹوا رہی ہو!"

پھر وہ سخت سست سے آگے بڑھ کر گالیوں پر اتر آتی اور کہتی۔

"تم ہماری عزت تباہ کر رہی ہو!"

اپنی ساس کی اس ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیوں اور گھرکیوں سے تنگ آ کر اگر لین شی

معمولی سادہ کپڑے پہنتی تو ساس کہتی ۔

"یہ چیتھڑے پہن کر ہمیں بدنام کرنا چاہتی ہو ــــ؟"

وہ اس پر بُری طرح برس پڑتی ۔

"تم چاہتی ہو کہ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں ــــ؟"

پھر وہ زبردستی وجہ پیدا کرتے ہوئے زمین پر پاؤں پٹخ پٹخ کر کہتی ۔

"ان چیتھڑوں میں لوگ تمھیں دیکھیں گے تو ہمیں کیا کہیں گے ــــ؟ تم تو چاہتی ہو کر لوگ ہمارے منہ پر تھوکیں ــــ؟"

اس طرح وہ ہر بات میں اسے ڈانٹنے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ نکال لیتی اور ہر کام میں نقص نکالنا تو اس کی عادت تھی ۔ بے چاری لین شی آگے سے کوئی جواب نہ دیتی اور چُپ چاپ یہ سارا ظلم برداشت کرتی رہتی ۔ صبح سویرے سے رات گئے تک اس کی مصیبتیں اور مشکلیں ختم نہ ہوتی تھیں ۔ جب وہ ہنڈیا روٹی سے فارغ ہوتی تو جھاڑو برتن میں لگ جاتی ، جب اس سے چھٹکارا ملتا تو ہاتھ کی کھڈی پہ کپڑا بُننے کے لیے بیٹھ جاتی ، اور رات گئے تک بیٹھی کپڑا بُنتی رہتی ۔ اس کے نازک ہاتھ دُکھنے لگتے ، جسم نڈھال ہو جاتا اور آنکھوں میں نیند جھولنے لگتی لیکن اسے اس بات کی اجازت نہ ہوتی کہ وہ بھی دو گھڑیاں آرام کرلے ۔ پھر یہ بات یہیں ختم نہ ہوتی تھی بلکہ ایک مصیبت انجام کو پہنچتی تو دوسری بدبختی سر اٹھا لیتی ۔ جب وہ اس قدر محنت اور نفاست سے بُنا ہوا کپڑا لے کر اپنی ساس کے پاس جاتی تو وہ بجائے تعریف کرنے کے اُلٹا اس پہ برس پڑتی اور کہتی ۔

"یہ کپڑا ہے ــــ؟ اسے کپڑا کہتے ہیں ــــ؟!"

وہ یہ ہرگز نہ دیکھتی کہ اس بے چاری نے کتنا نفیس ریشمی کپڑا بُنا ہے ۔ رات رات بھر محنت کی ہے بلکہ کہتی ۔

"تم بہت آہستہ کپڑا بُنتی ہو ــــ اور وہ بھی تمھیں ٹھیک سے بُننا نہیں آتا ۔"

اس کی نظر میں لین شی کا کوئی کام درست نہ ہوتا تھا ۔ اگر درست ہوتا بھی تو وہ اس کی دسیوں خرابیاں بیان کرنے بیٹھ جاتی ــــ اس طرح بے چاری لین شی ایک مظلوم و بے کس

کی طرح دن بسر کر رہی تھی ـــــ وہ اپنی ظالم ساس کی زیادتیوں کا تذکرہ اپنے شوہر سے بھی نہیں کرتی تھی۔ دراصل شکوہ وشکایت کرنا اس کی فطرت اور عادت کے خلاف تھا ـــــ اس پر جب بھی ظلم ہوتا، جو بھی ستم ٹوٹتا وہ اسے خاموشی اور صبر سے برداشت کر لیتی۔ اسی طرح دن گزرتے رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ساس کے ظلم بھی بڑھتے گئے۔

ایک روز لین شی اپنے کمرے میں اداس بیٹھی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ اتنے میں اس کی نند کمرے میں آئی۔ اس نے دیکھا، اس کی بھابی اداس ہے۔ وہ اپنی ماں کے ظلم سے بھی واقف تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی بھابی مظلوم ہے۔ اس پر زیادتیاں کی جاتی ہیں مگر وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکتی تھی ـــــ وہ خود مجبور تھی ـــــ اپنی بدمزاج اور مغرور ماں کے آگے کچھ کہنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا ـــــ اس نے کمرے میں آ کر جب دیکھا کہ لین شی بہت اداس ہے تو وہ پیار سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"بھابی! تم اس قدر اداس کیوں ہو ـــــ؟ مجھے بھی تو بتاؤ ـــــ؟"

حالانکہ وہ اس کی اداسی کی وجہ جانتی تھی لیکن پھر بھی اس نے اس کا دل بہلانے کی غرض سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ پھر چند منٹ کے بعد کہنے لگی۔

"میری پیاری بھابی ـــــ! آج مجھے ستار بجا کر سناؤ ـــــ؟"

گو اس وقت لین شی کا جی نہ چاہتا تھا لیکن وہ اپنی نند سے انکار نہ کر سکی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی نند اسے بہت چاہتی ہے اس لیے وہ اسے ستار پر ایک نغمہ سنانے پر راضی ہو گئی۔

لین شی ستار بجا رہی تھی اور اس کی نند اس کے پاس بیٹھی بڑے انہماک سے سن رہی تھی۔ اتنے میں چونگ چینگ بھی گھر آ گیا۔ اس نے جب ستار پر بجائی جانے والی غمگین اور اداس دھن سنی تو وہ سیدھا لین شی کے کمرے میں چلا گیا ـــــ لین شی نے جوں ہی شوہر کو دیکھا۔ اس نے ستار بجانا بند کر دیا مگر چونگ چینگ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی وہی نغمہ سناؤ جو تم ابھی بجا رہی تھیں ـــــ؟"

بھلا لین شی کیسے انکار کر سکتی تھی ـــــ؟ وہ اپنے شوہر کے کہنے پر دوبارہ وہی دھن بجانے لگی مگر ابھی چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ اس کی ساس جو چھپ کر نغمہ سن رہی تھی، اچانک

کمرے میں داخل ہوئی اور آگ بگولا سی ہو کر بیٹے اور بہو دونوں پہ برس پڑی — اس کا عالم یہ تھا کہ غصے میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی اور اس کے منہ میں کف بھر آیا تھا۔ اس نے پہلے لین شی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم نے میرے بیٹے پر جادو کر دیا ہے — اور اسے اپنا فریفتہ بنا لیا ہے —؟"

پھر وہ بھنّا کر چونگ چنگ کی طرف پلٹی اور چیختے ہوئے کہنے لگی۔

"تم روز بروز بے پروا ہوتے جا رہے ہو — تمہیں اپنی خاندانی روایات کا ذرا بھی خیال نہیں —؟"

چونگ چنگ نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"مگر ماں —! میں نے کیا کیا ہے —؟"

اس کا اتنا کہنا تھا کہ وہ اور بھی تیز ہو گئی۔

"کیا کہا —! ابھی تم نے کچھ کیا ہی نہیں — کیا اور کچھ کرنا باقی ہے —؟"

اس کے بعد اس نے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"آداب کے مطابق تمہیں گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے اپنی ماں کے پاس آنا چاہیے تھا لیکن تم میرے پاس آنے کی بجائے سیدھے اپنی بیوی کے پاس چلے گئے تم نے ایسا کیوں کیا ہے —؟"

پھر وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر کہنے لگی۔

"تم نے اپنی ماں کی توہین کی ہے!"

"تم نافرمان ہو گئے ہو!"

"تم بیوی کے غلام بن گئے ہو!"

اس کی آنکھیں غصے میں انگارہ بنی ہوئی تھیں، منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور جو کچھ اس کی زبان پہ آ رہا تھا واہی تباہی بکے جا رہی تھی — بے چاری لین شی اور چونگ چنگ خاموش بیٹھے سُن رہے تھے — وہ اسے کہہ بھی کیا سکتے تھے —؟

اگر کہتے بھی تو اس کا فائدہ کیا تھا ـــــ؟ یہ تو روز کا معمول بن چکا تھا۔

دن گزرتے گئے اور وقت دبے پاؤں آگے بڑھتا رہا ـــــ ایک روز چونگ چینگ کی ماں نے ایک رشتہ تلاش کرنے والی کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا۔

"میرے بیٹے کے لیے کوئی اور رشتہ ڈھونڈو ـــــ؟!"

رشتہ تلاش کرنے والی کو اور کیا چاہیے تھا ـــــ؟ اس کا تو کام ہی یہی تھا۔ اس کی بلا سے کسی کا رشتہ ٹوٹے یا طلاق ہو، اسے تو اپنے پیسوں کی فکر تھی۔ جب ہی چونگ چینگ کی ماں نے یہ بات کہی، اس نے موقع غنیمت جانا اور فوراً ہی ایک چن نامی لڑکی کی تعریفیں شروع کر دیں۔ کہنے لگی۔

"چن لاکھوں میں ایک ہے۔ چراغ لے کر ڈھونڈو تو ایسی لڑکی نہیں ملے گی!"

پھر اس نے اپنے تجربے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"چن حسین ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی امیر گھر کی بیٹی ہے ـــــ اگر چونگ چینگ کی اس سے شادی ہو گئی تو بہت سی دولت ملنے کی بھی اُمید ہے!"

چونگ چینگ کی ماں کچھ تو پہلے ہی حریص تھی اور اب جب کہ رشتہ تلاش کرنے والی نے اسے دولت کا لالچ دیا تو اس کا لالچی دل اور بھی مچل گیا۔ اس نے سوچا، اس طرح لین شی سے چھٹکارے کے ساتھ ساتھ بہت سی دولت بھی ہاتھ لگے گی۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بس یہ ٹھیک ہے ـــــ جس قدر جلد ہو سکے تم یہ رشتہ طے کرا دو!"

ابھی ان دونوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایکا ایکی لین شی کا بھائی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ لین شی بھی تھی اور وہ دونوں قدرے گھبرائے ہوئے تھے۔ لین شی کا بھائی اس کی ساس کو سلام دعا کرنے کے بعد بولا۔

"ہماری ماں شدید بیمار ہے ـــــ اور وہ اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتی ہے ـــــ؟"

پھر اس نے منت کے لہجے میں عرض کیا۔

"آپ لین شی کو جانے کی اجازت دے دیں تاکہ وہ اپنی ماں کی تمنا پوری کر سکے؟"

جواب میں لین شی کی ساس نے ماتھے پر تیوریاں ڈالتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر بُرا سا منہ بنا کر کہنے لگی۔

"تم لین شی کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو — مگر ایک بات یاد رکھنا —؟"

اس کے بعد اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"لین شی صرف تین روز کے لیے جا سکتی ہے — اسے ہر صورت میں تین روز کے اندر اندر واپس آجانا چاہیے — اگر یہ تین روز کے اندر واپس نہ آئی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا —!"

"جیسے آپ کہہ رہی ہیں ایسا ہی ہو گا — آپ فکر نہ کریں لین شی تین دن میں ضرور واپس آجائے جائے گی۔"

لین شی کے بھائی نے جواب دیا اور اپنی بہن کو ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔

لین شی کی ماں شدید بیمار تھی مگر لین شی کے جانے سے اس کی حالت سنبھل گئی کچھ تو اس لیے کہ اس نے اپنی بیٹی کو ایک عرصے کے بعد دیکھا تھا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ لین شی نے دن رات ایک کر کے اس کی ہر طرح سے دیکھ بھال کی — اس نے جی بھر کے اپنی ماں کی خدمت کی اور اسے آرام پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین روز میں اس کو کافی حد تک افاقہ ہو گیا — اس کی حالت جو پہلے روز بروز زیادہ بگڑتی جا رہی تھی، اب بہت حد تک سنبھل گئی تھی — یہ دیکھ کر لین شی نے اپنے دل میں سوچا۔

"اگر میں دو چار روز اور یہاں رہ جاؤں تو ہو سکتا ہے ماں بالکل ٹھیک ہو جائے —؟"

پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ۔

"میں چلی گئی تو پیچھے ماں کی دیکھ بھال کون کرے گا —؟"

لہٰذا اس نے اپنے بھائی سے کہا۔

"بھائی! تم میری سسرال جاؤ اور میری ساس سے کہو کہ وہ مجھے دو چار دن مزید

میکے میں رہنے کی اجازت دے دے ـــــ ماں ٹھیک ہو جائے تو میں واپس آجاؤں گی؟"

مگر اس کا بھائی اپنی تفریحات میں اس قدر مگن تھا کہ اس نے بہن کی بات سُنی اَن سُنی کر دی ـــــ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"یین سٹی دو چار دن اور یہاں رہ جائے گی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی ـــــ؟ کون اجازت لینے کے لیے مارا مارا پھرے ـــــ بہن تو یوں ہی گھبرا رہی ہے!"

ادھر لین شی بے چاری مجبور تھی ـــــ ماں کو اس حالت میں چھوڑ کر جا نہیں سکتی تھی اور دوسری طرف ظالم ساس کا خوف رہ رہ کر اسے دہلا رہا تھا۔ کیا کرے اور کیا نہ کرے ـــــ؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ـــــ اس نے ایک بار پھر بھائی کی منّت کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی! تم نہیں جانتے، میری ساس بڑی غصّے والی ہے، اس لیے تم جس طرح بھی ہو جا کر اس سے اجازت لے آؤ، ورنہ معلوم نہیں وہ مجھ پہ کیا ستم توڑے ـــــ؟"

اس پر اس کے بھائی نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔

"تم بے فکر رہو ـــــ میں اس سے اجازت لے آؤں گا"

اور پھر ـــــ اپنی تفریحات میں لگ گیا۔

چند روز کے بعد جب لین شی کی ماں بالکل صحت یاب ہو گئی تو اس نے ماں سے کہا۔

"ماں! اب تو تم بالکل ٹھیک ہو گئی ہو ـــــ اب مجھے اجازت دو تاکہ میں اپنی سسرال چلی جاؤں؟"

ماں نے اسے خوشی خوشی جانے کی اجازت دے دی ـــــ جب لین شی اپنی سسرال پہنچی تو اس کی ظالم ساس تو جیسے اسی کی منتظر تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی غصّے میں بھنا گئی اور ہاتھ نچا کر اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم تو صرف تین دن کے لیے گئی تھیں، پھر اتنے دن کیوں لگا دیے ـــــ؟"

لین شی نے منّت کے لہجے میں عرض کیا۔

"ہاں شدید بیمار تھی۔ گھر میں کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا اس لیے مجھے اس کے پاس رہنا پڑ گیا —— میں آپ سے اس کی معافی چاہتی ہوں ——؟"

مگر اس کی ساس نے تو جیسے اس کا عذر سنا ہی نہ تھا —— اسے تو صرف ایک ہی رَٹ تھی کہ۔

"تم بغیر اجازت تین دن سے زیادہ کیوں رہی ہو ——؟"

وہ کافی دیر تک یین شی کو بُرا بھلا کہتی رہی اور پھر حکم دیتے ہوئے بولی۔

"اب تمھاری سزا یہی ہے کہ تم پورا دن اور پوری رات آرام کیے بغیر کھڈی پہ کپڑا بُنو ——؟"

یین شی بے چاری کیا کر سکتی تھی ——؟ ظالم ساس نے جو حکم دیا وہ اسے خاموشی سے بجا لائی —— گو وہ ماں کی بیماری میں مسلسل جاگ جاگ کر تھکی ہوئی تھی لیکن وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی کہ اسے جو حکم ملا تھا اس پہ عمل کرے، —— وہ چُپ چاپ کمرے میں چلی گئی اور بیٹھ کر کھڈی پہ کپڑا بُننے لگی —— وہ سارا دن کپڑا بُنتی رہی۔ اس نے نہ کچھ کھایا اور نہ آرام کیا۔ اس طرح رات تک وہ تکان سے نڈھال ہو ہو چکی تھی —— پھر جب رات گہری ہو گئی اور اس کے نازک ہاتھ کپڑا بُنتے بُنتے جواب دے گئے تو وہ بے بس سی ہو کر رہ گئی —— وہ تکان سے چُور چُور ہو چکی تھی اور نیند اس کی آنکھوں میں لوریاں بن کر جھول رہی تھی —— یہاں تک کہ وہ کپڑا بُنتے بُنتے اونگھ گئی اور کھڈی پہ ہی جُھک کر سو گئی۔

دوسری طرف اس کی بے رحم ساس تو اسی لمحے کی منتظر بیٹھی تھی —— جوں ہی کھڈی چلنے کی آواز آنا بند ہوئی وہ لپک کر کمرے میں گئی اور دیکھا، یین شی کھڈی پہ جُھکی سو رہی تھی —— ساس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور چھڑی لے کر اسے پیٹنا شروع کر دیا۔

"اگر دوبارہ تم نے سونے کی کوشش کی تو تمھاری چمڑی ادھیڑ دوں گی ——!"

اس نے بڑی بے رحمی سے یین شی کو پیٹا اور یہ جملہ کہتے ہوئے واپس اپنے کمرے

میں چلی گئی ۔ بے چاری لین شی محض آنسو بہا کر رہ گئی ۔ وہ کھڈی پہ کپڑا بھی بُنتی جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دُکھتے ہوئے جسم کو سہلا بھی رہی تھی ـــــ ادھر لین شی کی نند دوسرے کمرے میں بیٹھی یہ سب باتیں سُن چکی تھی ۔ اس نے اپنی ماں کی جھڑکیاں بھی سُنی تھیں اور لین شی کی سسکیاں بھی مگر وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکتی تھی ۔ وہ تو صرف اس وقت کی منتظر تھی کہ کب ماں وہاں سے ٹلے اور وہ جا کر لین شی کے آنسو پونچھے ـــــ اس نے جب دیکھا کہ اس کی ماں اپنے کمرے میں واپس جا چکی ہے تو وہ دبے پاؤں اُٹھی اور چپکے سے لین شی کے پاس آ گئی ـــ لین شی کی حالت دیکھ کر اس کا بھی دل بھر آیا ۔ وہ اپنی بھابی سے لپٹ گئی اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے تسلّیاں دینے لگی ۔ جب ذرا لین شی کی ڈھارس بندھی تو اس نے اسے کان میں ہولے سے بتایا ۔

”بھابی ماں تم پہ اس لیے اتنی سختی کر رہی ہے کہ وہ بھائی کی شادی ایک اور جگہ کرنا چاہتی ہے ۔ اسی لیے وہ تم پہ اتنے ظلم کرتی ہے ۔“

پھر اس نے دبی زبان میں کہا ۔

”ماں نے بھائی کے لیے چن نامی ایک لڑکی کا رشتہ تلاش بھی کر لیا ہے ۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے دوسرے کمرے سے ماں کے زور زور سے بولنے کی آواز سُنائی دی اور وہ ڈر کر جلدی سے دوبارہ اپنے کمرے میں چلی گئی ۔

اس رات چونگ چنگ جب رات گئے گھر لوٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لین شی ابھی تک جاگ رہی تھی اور کپڑا بُن رہی تھی ـــــ اس نے گھر کے باہر ہی سے کھڈی چلنے کی آواز سُن لی تھی اور سمجھ گیا تھا کہ لین شی واپس آ گئی ہے ورنہ ہمارے گھر میں اور کون کپڑا بُن سکتا ہے ـــــ ؟ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا ۔

”لین شی اتنی رات تک کپڑا کیوں بُن رہی ہے ـــــ ؟ وہ گھر سے تھکی

تھکائی آئی ہوگی اسے کم ازکم ایک روز تو آرام کر لینا چاہیے تھا ــــ؟"

گو وہ اپنی مغرور اور بے رحم ماں کے ظلم وستم سے اچھی طرح واقف تھا لیکن پھر بھی اسے خیال تھا کہ۔

"لین شی کو ابھی تک سو جانا چاہیے تھا ــــ وہ سوئی کیوں نہیں ــــ؟"

اس نے یہ بھی دیکھا، گھر کے دوسرے لوگ آرام کر رہے تھے اور صرف وہی جاگ رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا کھڈی والے کمرے میں پہنچ گیا۔ جوں ہی لین شی نے چونگ چنگ کو اپنے قریب دیکھا، اس کی قوّت برداشت جواب دے گئی۔ اب تک جو آنسو رُکے ہوئے تھے وہ پلکوں کی دیواریں توڑ کر باہر آگئے اور رُخساروں پر بہتے ہوئے دامن میں گرنے لگے ــــ لین شی کے کچھ کہے سُنے بغیر ہی چونگ چنگ ساری بات سمجھ گیا۔ بہتے ہوئے آنسوؤں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو شاید لین شی کے لب بھی نہ بتا سکتے ــــ اس نے اپنے غصّے اور جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی جا کر ماں سے بات کرتا ہوں ــــ تم بے فکر رہو!"

مگر لین شی نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا۔

"اس وقت ماں سو گئی ہوگی ــــ اسے بے آرام کرنا اچھا نہیں ہے۔"

پھر وہ اپنے شوہر کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"یہ بات تو صبح بھی ہو سکتی ہے ــــ اس وقت ماں کو سونے دو۔"

لین شی کے اتنا کہنے پر چونگ چنگ نے اس وقت ماں سے بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ بیٹھ کر اسے تسلّیاں دینے لگا ــــ عین اس وقت اس کی ماں دھاڑتی چنگھاڑتی کمرے میں داخل ہوئی اور چونگ چنگ کو بُرا بھلا کہتی ہوئی چیخ کر بولی۔

"تم نے آج پھر مجھے نظر انداز کیا ہے ــــ جب یہ ڈائن گھر میں آجاتی ہے تو تم میری بالکل پروا نہیں کرتے۔ تمھیں اپنی خاندانی روایات کا ذرا سا بھی پاس

نہیں رہا ــــ؟"

پھر اس نے اس سے بھی تیز لہجے میں سوال کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم گھر میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے میرے پاس کیوں نہیں آئے؟ تم ضرورت سے زیادہ مجھ سے بے توجہی برتنے لگے ہو ــــ؟

اس پہ چونگ چنگ نے ماں کو سمجھانے کے انداز میں جواب دیا۔

"مجھے لین شی نے بتایا تھا کہ تم سو چکی ہو اس لیے میں نے تمھیں بے آرام کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ ورنہ میں پہلے تمھارے پاس ہی آتا۔"

لیکن ماں نے اس کی ایک نہ سُنی اور زور زور سے چیخنے کے انداز میں کہنے لگی۔

"تم پہ بیٹے کی حیثیت سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں تم ان کو پورا نہیں کر رہے مگر اب کان کھول کر سُن لو ــــ!"

پھر اس نے لین شی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اب تمھیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ تمھیں اپنی ماں کی ضرورت ہے یا اس بیوی کی ــــ؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک کاغذ اور قلم چونگ چنگ کی طرف بڑھایا اور بولی۔

"اس کاغذ پہ ابھی اور اسی وقت طلاق لکھو ــــ؟!"

اتنا کہہ کر اس نے لین شی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی تیاری کر لو ــــ صبح تمھیں تمھارے میکے روانہ کر دیا جائے گا۔"

چونگ چنگ ماں کے سامنے بے بس تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اس نے ماں کو بہتیرا سمجھایا، منایا، منت کی مگر سب بے سود ــــ اس کی بہن نے بھی ماں سے بہت کچھ کہا لیکن ماں کی تو ایک ہی رٹ تھی کہ لین شی کو ابھی اور اسی وقت طلاق نامہ لکھ دیا جائے ــــ آخر مجبور ہو کر چونگ چنگ کو طلاق نامہ لکھنا پڑا۔ اس نے لکھنے کو تو طلاق نامہ لکھ دیا تھا لیکن اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس پہ کیا

بیت رہی تھی ۔ اس کے آنسو تھے کہ رُکتے نہ تھے اور ہچکیاں تھیں کہ بند ہونے ہی نہ آتی تھیں ۔۔ اس نے روتے ہوئے یین شی سے کہا ۔

"پیاری یین شی ۔۔۔! تم وقتی طور پہ میکے چلی جاؤ ۔۔۔ اللہ نے چاہا تو میں بہت جلد تمھیں واپس لے آؤں گا ۔"

پھر وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا ۔

"یین شی ! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں ۔"

مگر یین شی جھوٹی امیدوں پہ جینے والی نہیں تھی ۔۔۔ وہ اس حقیقت کو کیسے جھٹلا سکتی تھی جو اس کے سامنے آ چکی تھی ۔۔۔ اس نے چونگ چنگ سے کہا ۔

"جو ہونا تھا وہ ہو چکا ۔۔۔ اب جھوٹی اُمیدوں کے سہارے لینا بے کار ہے بہتر یہ ہے کہ آنے والے حالات کا ہمّت سے مقابلہ کیا جائے ۔"

یین شی نے یہ کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ اس کے پیچھے پیچھے چونگ چنگ بھی تھا ۔ وہاں اس نے اپنی شادی والا رنگین اور خوب صورت گاؤن پہنا اور جہیز کی باقی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چونگ چنگ سے کہا ۔

"تم میرے جہیز کی یہ ساری چیزیں یادگار کے طور پہ اپنے پاس رکھ لو ۔۔!"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب کانپ رہے تھے ۔ وہ بولی ۔

"ہم نے تین سال کا عرصہ ایک ساتھ گزارا ہے ۔۔۔ ہو سکتا ہے ان چیزوں کی موجودگی سے اس کی یاد تازہ رہے ۔۔۔ !"

یین شی اور چونگ چنگ دونوں غم میں ڈوبے کھڑے تھے کہ اتنے میں اس کی نند بھی کمرے میں آ گئی ۔ اس نے بھی طلاق کی بات سُن لی تھی ۔۔۔ اس نے روتے ہوئے ۔

"میری پیاری بھابی !"

کہا اور یین شی سے لپٹ گئی ۔۔۔ اب وہ تینوں کمرے میں کھڑے آنسوؤں کے ہار پرو رہے تھے لیکن یہ ہار ایسے تھے جن کی قدر کرنے والا کوئی نہیں تھا ۔

دوسری صبح گھر کے باہر ایک گھوڑا گاڑی ین شی کا انتظار کر رہی تھی۔ ین شی نے آداب کے مطابق چلنے سے پہلے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی ساس سے اجازت مانگی اور کہا۔

"مجھ سے اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دیں ——؟"

مگر ظالم ساس کا دل اب بھی نہ پسیجا تھا —— اس کے سینے میں تو شاید دل تھا ہی نہیں —— وہ اسی طرح غرور میں تنی کھڑی رہی اور اس نے ین شی کی طرف دیکھا تک نہیں —— ین شی نے ایک حسرت بھری نگاہ مکان پر ڈالی۔ سب کو خدا حافظ کہا اور روتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو گئی۔

گھوڑا گاڑی سفر پر رواں دواں تھی اور اس میں ین شی غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر سسکیاں تھیں —— اس کے جذبات میں ہلچل تھی اور خیالات بھٹکے ہوئے تھے —— ایکا ایکی اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو چونگ چینگ گھوڑا دوڑائے چلا آ رہا تھا —— ین شی نے فوراً گاڑی رکوا دی اور جب چونگ چینگ اس کے قریب پہنچ گیا تو وہ گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ چونگ چینگ بھی گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور اس نے ین شی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ دونوں قریب ہی ایک جھیل کے کنارے جا کھڑے ہوئے جس کے ساتھ ہی ایک چٹان تھی —— چونگ چینگ نے اپنی محبت کی قسم کھاتے ہوئے اس چٹان اور جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پیاری ین شی —— تم جا رہی ہو مگر اتنی بات یاد رکھنا کہ میری محبت اس چٹان کی طرح ہمیشہ ثابت قدم رہے گی —— اور اس میں سدا اس جھیل کی سی لہریں اٹھتی رہیں گی!"

ین شی نے اس کی نم ناک آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔

"اور تم مجھے بھی دیکھو گے —— یہ آسمان اور زمین میرے عہد کے گواہ رہیں گے!"

دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف بڑے دُکھ سے دیکھا ۔۔۔ چند لمحے خاموش کھڑے رہے ۔۔۔ اور پھر بھیگی پلکوں کے ساتھ جدا ہو گئے ۔

جب یین سی اپنے میکے پہنچی تو چند لمحوں کے لیے وہ اپنے گھر کے باہر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی ۔۔۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ۔

"میں ایک مطلقہ عورت ہوں ۔۔۔ کیا منہ لے کر اپنی ماں کے سامنے جاؤں گی ؟ وہ دل میں کیا سوچے گی ۔۔۔۔۔۔؟ بھائی کیا خیال کرے گا ۔۔۔؟"

وہ یہ سب باتیں سوچ تو رہی تھی لیکن اب گھر جائے بغیر چارہ بھی نہ تھا ۔ آخر اس نے ہمت کی اور گھر میں داخل ہو گئی ۔ جوں ہی ماں نے اسے دیکھا وہ کچھ شش و پنج میں پڑ گئی ۔۔۔ وہ سوچنے لگی ، ابھی کل ہی تو یہ گھر سے گئی ہے پھر آج کیسے واپس آگئی ۔ ؟ اس کا دل کسی ان جانے خوف سے دھڑکنے لگا ۔۔۔۔ پھر جب یین سی نے اسے یہ بتایا کہ اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہے تو وہ جیسے سکتے میں آگئی ۔۔۔۔ یین سی نے اپنی ماں کو اپنی پوری کہانی سنائی کہ اس دوران میں اس پر کیا کیا ظلم کیے گئے ، اسے کس کس طرح سے ستایا رلایا گیا ، اور کیسے کیسے طریقوں سے تنگ کیا گیا ۔ بوڑھی ماں نے یہ سب کچھ سنا تو کلیجہ تھام کر رہ گئی ۔۔۔۔ وہ اپنی مظلوم بیٹی کی قسمت پر آنسو بہانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی ۔۔۔۔! جس وقت ماں بیٹی آپس میں باتیں کر رہی تھیں ، اور ایک دوسری کا دُکھ بٹا رہی تھیں ، اس وقت یین سی کا بھائی اپنے دو دوستوں کے ساتھ گھر میں بیٹھا شراب پی رہا تھا ۔ اس کے دوستوں میں سے ایک مجسٹریٹ کا بیٹا تھا اور دوسرا ایک پولیس افسر تھا ۔۔۔ بھائی نے جب بہن کی طلاق کا سُنا تو غصّے میں بھرا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا ۔۔۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے اس کے دونوں دوست بھی آ گئے ۔ اس وقت وہ دونوں نشے میں بدمست تھے اور ان کی حریص نظریں یین سی کے حُسن و جوانی کا جائزہ لے رہی تھیں ۔۔۔ وہ دونوں دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ ۔

"کسی طرح یین سی کو اپنے قبضے میں لانا چاہیے !"

یین سی اور اس کی ماں اپنے دُکھ میں کھوئی ہوئی تھیں ۔۔۔ بھلا انھیں اتنی فرصت

کہاں تھی کہ کسی کی نیت کا اندازہ کرتیں ــــ وہ دونوں بیٹھی اپنی اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہیں۔

یین شی کو گھر میں آئے مشکل سے آٹھ دس روز ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن مجسٹریٹ کے بیٹے کی طرف سے یین شی کے رشتے کا پیغام آ پہنچا ــــ ماں نے یین شی کو بتایا تو اس نے جواب دیا۔

"ماں! اب میں شادی نہیں کروں گی!"

پھر اس نے ماں کو بتایا کہ۔

"میں نے چونگ چینگ سے عہد کیا ہے ــــ میں اس کی محبت کو دھوکہ نہیں دے سکتی ــــ میں ہرگز شادی نہیں کروں گی!"

ماں نے بھی اسے مجبور کرنا مناسب نہ سمجھا اور رشتے کا پیغام لانے والی کو واپس بھیج دیا لیکن ابھی اس بات کو دو چار روز ہی بیتے ہوں گے کہ پولیس افسر کی طرف سے یین شی کے لیے رشتے کا پیغام آگیا ــــ یہ پیغام یین شی کی ماں کی بجائے اس کے بھائی کو ملا اور اس نے اپنی بہن یا ماں سے پوچھے بغیر ہی اسے منظور بھی کر لیا ــــ جب یین شی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے کہا۔

"نہیں ــــ! میں شادی نہیں کروں گی!"

اس پر اس کے آوارہ مزاج بھائی نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم شادی نہیں کرو گی تو کیا ساری زندگی یوں ہی یہاں بیٹھی رہو گی ــــ؟"

پھر وہ جیسے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمہیں ساری عمر گھر بٹھانے کا ٹھیکہ نہیں لیا ــــ تمہیں یہ شادی کرنا ہوگی!"

اب یین شی کیا جواب دیتی ــــ! کیا کرتی ــــ؟ مجبوریاں تو قدم قدم پر اس کے پاؤں کی بیڑیاں بنتی جا رہی تھیں۔ اس پر بھائی کے برتاؤ نے اسے اور بھی مایوس کر دیا تھا ــــ وہ تو یہ سوچ کے آئی تھی کہ زندگی کے باقی دن کسی نہ کسی طرح گزار

لے گی مگر بدقسمتی نے اس کا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا تھا ــــ اب اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔

"خودکشی ــــ! ہاں! خودکشی ــــ!"

اس نے اپنے دل میں سوچا اور پھر پکّا ارادہ کر لیا کہ۔

"خودکشی کر لوں ــــ بس یہی ایک راستہ ہے!"

جب اس کی شادی میں چند روز باقی رہ گئے تو اس کے بھائی اور ماں نے اصرار کیا کہ وہ کمر میں شادی کا روایتی پٹکا باندھ لے ــــ اس نے خاموشی سے شادی کا پٹکا باندھ تو لیا لیکن اس اُمید کے ساتھ کہ وہ خودکشی کرنے سے پہلے ایک بار چونگ چنگ کو ضرور دیکھے گی ــــ اس سے ضرور ملے گی ــــ مگر کس طرح ملے گی ــــ؟ یہی ایک بات اس کے دل کی چبھن بنی ہوئی تھی۔

اسی شام لین شی کی شادی تھی ــــ آج اس کی اُمیدوں اور آرزوؤں کے سارے چراغ ہمیشہ کے لیے بجھنے والے تھے ــــ اب وہ کبھی چونگ چنگ کو نہ دیکھ سکے گی ــــ اس سے کبھی نہ مل سکے گی ــــ اس کی محبت کا عہد ٹوٹ رہا تھا ــــ وہ اداس بیٹھی تھی کہ اچانک دُور سے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی ــــ پھر یہ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی چلی گئی ــــ یہ آواز اس کے دل کی آواز تھی ــــ اس نے جلدی سے باہر دیکھا تو اسے چونگ چنگ آتا دکھائی دیا ــــ چونگ چنگ کو دیکھ کر اس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ــــ وہ چھپتے چھپاتے، سب کی نظروں سے بچتی ہوئی گھر سے نکلی اور اپنے پیارے محبوب تک پہنچ گئی ــــ چونگ چنگ اس کی شادی کی خبر سُن چکا تھا ــــ اس نے غُصّے میں کہا۔

"لین شی ــــ! تمھاری محبت جھوٹی تھی ــــ تم نے اپنا عہد توڑ دیا ــــ؟"

پھر وہ اسے الزام دیتے ہوئے بولا۔

"تم بے وفا نکلی ہو ــــ!"

لیکن جواب میں جب لین شی نے اسے ساری بات بتائی تو اس پر حقیقت کُھلی۔

اب اس کا غصّہ افسوس اور مایوسی میں بدل گیا تھا ـــــ اسے بے چاری لین شی پر رحم آ رہا تھا ـــ اس نے کس قدر دکھ اٹھائے تھے ـــ وہ کتنی مظلوم تھی ـــ!؟ اس نے حسرت بھری نظروں سے لین شی کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کے بولا۔

" افسوس! اب ہم کبھی نہ مل سکیں گے!"

" قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا!"

اسی شام ـــ اسی خونیں شام، جب سائے گہرے ہو گئے تو لین شی گھر والوں کی نظروں سے چھپتی چھپاتی اپنے گھر کے باغیچے میں آگئی ـــ وہ باغیچے میں بنے ہوئے گہرے تالاب کے کنارے کھڑی ہو گئی ـــ اس نے ایک حسرت بھری نظر سے چاروں طرف دیکھا اور پھر آسمان کو تکتے ہوئے بولی۔

" اے آسمان! اے زمین! اس بات کے گواہ رہنا کہ میں اپنی محبت میں سچی ہوں!"

اس کے بعد اس نے پھر لب کھولے اور دھیمی مگر دردناک آواز میں بولی۔

" پیارے چونگ چنگ ـــ میرے پیارے محبوب ـــ تمھاری لین شی اپنے عہد کی سچی ہے!"

اور پھر ـــ دوسرے ہی لمحے وہ تالاب کے گہرے پانی میں کود چکی تھی جہاں اس وقت تڑپتی ہوئی چند لہریں مچل رہی تھیں۔

دوسری جانب جب چونگ چنگ کو یہ پتہ چلا کہ لین شی نے خودکشی کر لی ہے تو وہ جیسے دیوانہ ہو گیا تھا ـــ لین شی کا سچا اور پکا پیار اس کی نس نس میں جاگ پڑا ـــ اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا ـــ اس نے ایک نظر فضا میں دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا۔

" پیاری لین شی ـــ! میرا پیار چٹان کی طرح ثابت قدم ہے ـــ اس میں سے ہمیشہ جھیل کی طرح لہریں اٹھتی رہیں گی ـــ!

اس نے اتنا کہا اور اپنی کمر سے پٹکا کھول کر درخت کے ایک تنے سے باندھ دیا ـــ اس کے چند ہی لمحوں بعد چونگ چنگ کا بے جان جسم درخت کے ساتھ جھول

رہا تھا۔

لین شی اور چونگ چنگ کی خودکشی کی خبر چاروں طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی — ان دونوں نے سچے پیار کی خاطر جان دے دی تھی — لوگ ان کی محبت کے دل سے قائل ہو گئے تھے — انھوں نے عقیدت کے طور پر دونوں کی لاشیں ایک ساتھ ایک سرو کے درخت کے نیچے دفن کر دیں تاکہ وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔

وہ دن اور آج کا دن سرو کا درخت ہمیشہ کے لیے پیار کا استعارہ بن گیا — دُنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے سرو کے اَن گِنت سرسبز درخت آج بھی لین شی اور چونگ چنگ کے سچے پیار کی گواہی دے رہے ہیں۔

۲

دو بھائی

HOW THE BROTHERS DIVIDED THEIR PROPERTY



اگلے وقتوں کی بات ہے کسی جگہ ایک گاؤں آباد تھا اور اس گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ بڑے بھائی کا نام بڑا لینگ تھا اور چھوٹے کو چھوٹا لینگ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ان کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ انھوں نے ترکے میں کوئی زیادہ جائیداد نہیں چھوڑی تھی، صرف زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا جو کچھ زیادہ زرخیز بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک بیل تھا جو کھیتی باڑی کے کام آتا تھا اور ایک پیلے رنگ کا کتا تھا۔ بس ان دونوں کی کُل یہی جائیداد تھی اور یہی ان کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔

بڑا لینگ نہایت سُست اور کاہل واقع ہوا تھا۔ وہ دن میں کھیتوں میں جانے کی بجائے گھر میں پڑا چارپائیاں توڑتا رہتا۔ نہ بیل کے چارے کا بندوبست کرتا، نہ کھیتی باڑی میں حصہ لیتا، اور نہ اسے گاہنے بونے کی فکر تھی۔ ہاں، وہ اتنا کام ضرور کرتا تھا کہ دونوں وقت اچھا بُرا کھانا تیار کر لیتا ـــــ یہ کام بھی وہ اس بددلی سے کرتا تھا جیسے اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔ باقی تمام کام اس نے اپنے چھوٹے بھائی کے کندھوں پر ڈال رکھے تھے۔ چھوٹا لینگ بڑا محنتی اور نیک دل تھا۔ وہی کھیتوں میں ہل چلاتا، وہی بوتا کاٹتا، وہی بیل کی دیکھ بھال کرتا اور وہی اوپر کے دوسرے کام سنبھالتا۔ اس کے برعکس بڑا لینگ مزے سے دن رات گھر میں پڑا آرام کرتا رہتا۔

ایک روز بڑے لینگ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ سوچنے لگا۔

"ہم دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے الگ ہوجانا چاہیے!"
یہی کچھ سوچ کر اس نے چھوٹے ینگ سے کہا۔
"جو درخت بڑے ہوجاتے ہیں ان کی شاخیں بھی زیادہ اور بڑی ہوجاتی ہیں۔
اسی طرح جب بچے جوان ہوجاتے ہیں تو وہ اپنی جائیداد تقسیم کرلیتے ہیں۔
بڑے درختوں کی طرح ان کی شاخیں بھی بڑھ کر زیادہ ہوجاتی ہیں۔"
اتنا کہہ کر اس نے چھوٹے ینگ کو غور سے دیکھا اور بولا۔
"تم جانتے ہو، ہم دونوں بھی جوان ہوچکے ہیں —— چنانچہ ہمیں بھی اپنی جائیداد تقسیم کرلینی چاہیے اور الگ الگ رہنا چاہیے ——!"
چھوٹے ینگ کے لیے بھائی کی یہ بات بڑی عجیب تھی حالانکہ سارا کام تو وہی کرتا تھا۔ بڑا تو سارا دن گھر میں پڑا رہتا تھا مگر اس کے باوجود وہ الگ ہونے کے لیے کہہ رہا تھا —— اس نے تعجب سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔
"ہم دونوں بڑے مزے میں ایک ساتھ رہ رہے ہیں —— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ الگ کیوں ہوجائیں —— اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا ——؟"
اس کے اس جواب سے بڑے بھائی کو خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ الٹا ناراض ہونے لگا۔ اس نے بڑی تلخی اور غصے میں کہا۔
"میں تمھیں کہہ رہا ہوں کہ ہمیں ہر صورت میں الگ ہوجانا چاہیے۔
یہ میرا آخری فیصلہ ہے!"
اتنا کہہ کر اس نے قہر آلود نظروں سے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔
"تم ہمیشہ یہ انتظار کرتے رہتے ہو کہ میں تمھارے لیے کھانا تیار کروں اور تم مزے سے بیٹھ کر کھالو —— کھانا میں پکاؤں، ہاتھ میں جلاؤں اور تم مزے اڑاؤ —— مگر آج میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ اب میں یہ کام نہیں کروں گا اس لیے جتنی جلدی ہوسکے ہمیں الگ ہوجانا چاہیے!"

چھوٹے بھائی نے بڑے کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے اس کی ایک نہ سُنی — وہ اسی بات پہ اڑا رہا کہ کچھ بھی ہو جائے اب ہم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے — جب چھوٹے یینگ نے دیکھا کہ اسے قائل کرنا مشکل ہے تو وہ بھی مجبور ہو گیا — لہٰذا دونوں بھائی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے — بڑے یینگ نے اس موقع پر بڑی چالاکی اور بے ایمانی کی — اس نے بیل خود رکھ لیا اور پیلا کُتّا چھوٹے یینگ کو دے دیا — پھر زمین کا وہ حصّہ جو اچھا اور زرخیز تھا، خود لے لیا اور جو بنجر اور پہاڑی پہ واقع تھا وہ چھوٹے بھائی کے حوالے کر دیا — اس طرح ان کی جائیداد بھی تقسیم ہو گئی اور وہ الگ الگ رہنے لگے۔

ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بعد دونوں بھائیوں کی عادتوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا — بڑا یینگ بدستور اسی طرح کاہل اور کام چور تھا اور چھوٹا پہلے سے بھی زیادہ محنتی ہو گیا تھا — بڑا بھائی اسی طرح سارا دن اپنے گھر ہی پڑا رہتا — وہ نہ اپنے بیل کی دیکھ بھال کرتا، نہ ہل جوتتا اور نہ کھیتی باڑی کی طرف توجہ دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیل چارہ نہ ملنے کی وجہ سے کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ مسلسل بھوکا رہنے سے اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور اب وہ محنت کرنے یا ہل چلانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا — وہ چلتا تو اس طرح جیسے ڈگمگا رہا ہو اور بیٹھتا تو یوں جیسے اب کبھی نہ اُٹھ سکے گا — بڑے یینگ نے اپنی زمین کی طرف بھی توجہ نہ دی تھی حالانکہ اس کے پاس وہ حصّہ تھا جو زرخیز تھا لیکن جب اس میں عرصے تک نہ ہل چلایا گیا، نہ اس میں گاہی کی گئی، نہ بیج پڑا اور نہ کوئی فصل اُگی تو وہ بھی بنجر ہوتی چلی گئی — اس کے برعکس چھوٹے یینگ نے جُدا ہونے کے بعد اور زیادہ محنت شروع کر دی — وہ اپنے کُتّے کی بھی خوب دیکھ بھال کرتا۔ اسے نہلاتا اور اس کی خوراک کا خاص طور پہ خیال رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ موٹا تازہ ہو گیا۔ چھوٹا یینگ روزانہ جب پہاڑوں میں لکڑیاں کاٹنے جاتا تو اپنے کُتّے کو بھی ساتھ لے جاتا — اس طرح وہ دونوں صحت مند اور خوش تھے۔

جب موسم بہار کا زمانہ آیا تو دوسرے تمام لوگ اپنے کھیتوں میں فصلیں اُگانے کے لیے زمین گاہنے اور ہل چلانے لگے ــــ اس موقع پر چھوٹا ینگ بڑا اداس تھا ــــ وہ اپنی زمین میں ہل چلائے تو کیسے چلائے ــــ؟ اس کے پاس بیل نہیں تھا اور اس سلسلے میں بڑا فکر مند تھا ــ کرے تو کیا کرے ــــ؟ اگر نئی فصل نہیں اُگاتا تو کھائے گا کہاں سے ــــ؟ اس کے پاس جو تھوڑا بہت اناج جمع تھا وہ بھی ختم ہو جائے گا تو پھر کیا ہوگا ــــ؟ وہ ہر وقت اسی خیال میں کھویا رہتا تھا ــ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اسے یہی فکر کھائے جاتی تھی ــــ ایک روز وہ اسی سوچ بچار میں آگ جلائے بیٹھا تھا ــــ پریشانی میں سوچتے سوچتے وہ اونگھنے لگا، اتنے میں کُتا اسے دیکھ کر زور زور سے بھونکا۔ چھوٹا ینگ کُتے کی آواز سن کر چونک کر ہوشیار ہو گیا اور حیرانی سے کُتے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ جلدی سے اُٹھا، اپنی کسّی اور درانتی سنبھالی اور اپنے کھیت کی طرف روانہ ہو گیا۔ کُتا بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کھیت میں پہنچ کر وہ کسّی سے زمین تیار کرنے لگا۔ اس طرح وہ کافی دیر تک محنت کرتا رہا۔ جب بہت زیادہ تھک گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر سستانے لگا ــــ اس وقت وہ ہانپ رہا تھا اور اس کا سارا بدن پسینے میں تر بتر تھا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ کُتا پھر اسے دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگا ــــ اس نے تعجب اور پریشانی میں کُتے کی جانب دیکھا اور قدرے جھنجھلا کر بولا۔

"اے پیلے کُتے ــــ! اے پیلے کُتے ــــ! تو اس طرح کیوں بھونک رہا ہے ــ؟ آخر تو کیا چاہتا ہے ــــ؟"

اتنا کہہ کر اس نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا اور مایوسی کے لہجے میں کہنے لگا۔

"کیا تو میرے لیے کھیت میں ہل چلا سکتا ہے ــــ؟"

اس کا اتنا کہنا تھا کہ کُتا جلدی سے کھیت میں جا کر کھڑا ہو گیا ــــ وہ کھیت میں کھڑا چھوٹے ینگ کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس بات کا منتظر ہو کہ اسے ہل میں جوتا جائے ــ ابھی چھوٹا ینگ اس کا اشارہ پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا

کہ کُتا پھر زور زور سے بھونکا ــــ چھوٹے لینگ نے جب کُتے کو بار بار بھونکتے دیکھا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے بیل کی جگہ استعمال کرنا چاہیے ــــ اس نے اسی وقت ایک چھوٹے ہل کا انتظام کیا تاکہ کُتا آسانی سے کھینچ سکے۔ پھر اس نے کُتے کو ہل میں جوتا اور کھیت میں ہل چلانے لگا۔ اس طرح وہ سارا دن ہل چلاتا رہا اور شام ہو گئی تو گھر چلا آیا۔ اس رات اس نے کُتے کو اور زیادہ اچھی خوراک دی اور دوسرے دن کے انتظار میں سو گیا۔

اب اس کا یہ روز کا معمول بن چکا تھا کہ صبح ہوتے ہی کُتے کو ساتھ لے کر کھیت میں پہنچ جاتا۔ اسے ہل میں جوت دیتا اور دن بھر ہل چلاتا رہتا ــــ اسی طرح وہ کئی دن تک مسلسل ہل چلاتا رہا ــــ یہاں تک کہ اس کا کھیت بیج بونے اور فصل اُگانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا ــــ اتفاق سے اسی دوران بڑا لینگ اس طرف نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ چھوٹے بھائی کا کھیت فصل بونے کے لیے بالکل تیار ہے۔ اسے بڑا تعجب ہوا کہ اس کے پاس تو بیل بھی نہیں ہے، پھر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ــــ؟ اس کی تو زمین بھی اچھی نہیں تھی اور پہاڑی پر واقع ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہو گیا ــــ؟ اسے کھوج ہوئی کہ اس کا راز معلوم کرنا چاہیے۔ وہ اسی وقت بھاگا بھاگا چھوٹے لینگ کے پاس گیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"اے چھوٹے لینگ ــــ! تمھارے پاس تو بیل بھی نہیں ہے پھر تم نے اپنی زمین میں ہل کیسے چلایا اور فصل اُگانے کے لیے کیسے تیار کی ــــ؟"

بڑے بھائی کی اس بات پر چھوٹا لینگ بڑے فخر اور خوشی سے بولا۔

"یہ میں نے خود تیار کی ہے ــــ!"

"مگر تمھارے پاس تو بیل نہیں ہے ــــ؟"

بڑا بھائی تعجب سے پوچھنے لگا۔

"تم نے بیل کے بغیر زمین کو کیسے تیار کر لیا ــــ؟"

"ٹھیک ہے، میرے پاس بیل نہیں ہے ــــ لیکن کیا میرے پاس میرا پیلا کُتا بھی نہیں ہے ــــ؟"

یہ جواب سن کر بڑا بھائی اور بھی حیران تھا کہ ایک کتا کھیت میں ہل کیسے چلا سکتا ہے ——؟ اس نے دل میں خیال کیا، شاید اس کا چھوٹا بھائی اسے بے وقوف بنا رہا ہے اس لیے کہنے لگا۔

"مگر ایک کتا کھیت میں ہل کیسے چلا سکتا ہے ——؟ یہ ایک ناممکن بات ہے ——!"

"جو بھی ہو —— مگر میں نے تو اپنے کتے ہی سے کھیت تیار کیا ہے۔"

بڑا اینگ اب واقعی بہت حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ——؟ مگر جب چھوٹے بھائی نے زور دے کر اسے بتایا کہ میرا کھیت کتے ہی نے تیار کیا ہے تو اسے یقین آ گیا —— سوچنے لگا، ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو ——! یکایک اسے یہ بھی خیال آیا کہ میرا بیل تو ہڈیوں کا پنجر بن چکا ہے، وہ ہل چلانے کے قابل نہیں رہا، کیوں نہ یہ کتا ادھار لے لوں اور اس سے اپنا کھیت تیار کر لوں ——! یہی سوچ کر وہ اپنے چھوٹے بھائی سے کہنے لگا۔

"دیکھو —— تم میرے چھوٹے بھائی ہو —— اپنا کتا ایک روز کے لیے مجھے اُدھار دے دو تاکہ میں بھی اپنا کھیت تیار کر لوں ——؟ میں شام ہوتے ہی تمھارا کتا لوٹا دوں گا۔"

اس پر چھوٹا بھائی فوراً بولا۔

"ہاں —— تم خوشی سے لے جاؤ!"

لہٰذا بڑا اینگ کتا لے کر چلا گیا اور اسے اپنے کھیت میں لے جا کر ہل میں جوت دیا۔ اسے خیال تھا کہ ہل میں جوتنے کے ساتھ ہی کتا ہل کھینچنے لگے گا اور ایک ہی دن میں اس کا کھیت تیار ہو جائے گا مگر کتا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا۔ اس نے اسے ہانکنے کی بہتیری کوشش کی، طرح طرح کے جتن کر کے اسے ہل کھینچنے پر مجبور کیا لیکن سب بے سود۔ کتا جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا —— یہ دیکھ کر بڑا اینگ غصے میں بھنا گیا۔ اس نے چابک سے کتے کو مارنا شروع کر دیا —— مارنے کے باوجود کتا

ہل کھینچنے پر تیار نہ ہوا ــــ اس پر وہ اور زیادہ غصّے میں آگیا اور بڑی بے رحمی سے کُتّے کو مارنے لگا۔ اس نے کُتّے کو اس قدر مارا کہ وہ بے چارہ بے زبان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

دوسری طرف چھوٹا لینگ اپنے کُتّے کی واپسی کا منتظر تھا۔ جب دن ختم ہوگیا اور شام سر پہ آگئی تو اس نے دیکھا، کُتّا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اسے فکر لاحق ہوئی ــــ اسی وقت اپنے بڑے بھائی کے گھر گیا اور اس پوچھنے لگا۔

"بھائی! میرا کُتّا کہاں ہے ــــ؟"

جواب میں بڑا بھائی اس کی طرف دیکھے بغیر بڑی بے اعتنائی سے بولا۔

"خدا جانے کہاں مرکھپ گیا ہے"

بڑے بھائی کا یہ روکھا سا جواب سُن کر چھوٹا لینگ ہکّا بکّا رہ گیا ــــ اس نے ہمت کر کے پھر پوچھا۔

"مگر اسے تو تم لے گئے تھے ــــ؟"

اس پر اس کا بڑا بھائی بڑی تلخی سے جھڑک کر بولا۔

"میں نے کہہ جو دیا کہ مجھے نہیں معلوم!"

جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا اس وقت اس کے چہرے پر ناگوار مایوسی کے تاثرات تھے۔ چھوٹے لینگ نے اس سے مزید کوئی سوال نہ کیا اور خاموشی سے اُٹھ کر چلا آیا۔ اب وہ خود کُتّے کی تلاش میں چل دیا۔ گاؤں میں اِدھر اُدھر گھوم کر اسے ڈھونڈتا رہا۔ اس نے ہر جگہ دیکھا، ہر طرف گھوما مگر کُتّے کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا۔ جب وہ گاؤں میں تلاش کرتے کرتے مایوس ہوگیا تو کھیتوں کی جانب نکل گیا ــــ آخر کار اس نے دیکھا کہ اس کا کُتّا ایک جگہ مُردہ پڑا تھا۔ اس کا جسم اکڑ چکا تھا اور وہ جھاڑ پھونس میں آدھا چھپا ہوا تھا۔ چھوٹے لینگ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے شدید رنج ہوا مگر کیا کر سکتا تھا ــــ؟ تھوڑی دیر تک وہاں افسوس میں کھڑا رہا اور پھر مُردہ کُتّے کو اُٹھا کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ کُتّے کی لاش اُٹھائے جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ

رو رو کر کہتا جارہا تھا۔

"جب ہم نے اپنی جائیداد تقسیم کی تو میرے حصّے میں ایک کُتّا آیا۔
اس نے میرے کھیت میں ہل چلانے میں میری مدد کی۔ میں نے کبھی اسے
دھتکارا یا جھڑکی نہیں دی۔
اب کسی نے میرے کُتّے کو جان سے مار دیا ہے —— میں اس کا دُکھ کیسے
برداشت کروں گا ——؟
میرا دُکھ بہت شدید ہے —— اور میں اپنے اس دکھ کو چھپا نہیں سکتا۔"

چھوٹا لینگ اپنے مردہ کُتّے کو لے آیا اور اسے مٹّی کے ایک ٹیلے میں دبا دیا۔ اب وہ روزانہ صبح سویرے اُٹھتا اور سب سے پہلے اپنے کُتّے کی قبر پہ جاتا۔ یہ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔

ایک روز صبح جب وہ اپنے کُتّے کی قبر پر گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جس ٹیلے میں اس نے کُتّے کو دبایا تھا اس پر سُنہرے رنگ کا ایک بانس کا پودا اُگا ہوا تھا۔ یہ بات اس کے لیے بڑی حیرانی کی تھی۔ وہ تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر واپس گھر آگیا اور گھر آکر اس عجیب و غریب پودے کے بارے میں سوچتا رہا —— اس نے زندگی میں آج تک اس قسم کا بانس کا پودا نہیں دیکھا تھا جو اس طرح سُنہرا اور اس قدر چمکیلا ہو۔ وہ دن بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا اور جب اس سے دوسری صبح کے انتظار میں صبر نہ ہو سکا تو رات کو پھر وہاں پہنچ گیا —— وہاں جا کر دیکھا تو اور بھی تعجب میں پڑ گیا۔ صبح کے وقت بانس کا جو چھوٹا سا پودا تھا، وہ رات تک بہت بڑے درخت میں تبدیل ہو چکا تھا —— وہ اس قدر سُنہرا اور چمکیلا تھا کہ اس میں سے کرنیں پھُوٹ رہی تھیں —— چھوٹا لینگ بہت خوش ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر بانس کے درخت کی ایک نیچے والی شاخ کو پکڑا اور اسے ہلا ہلا کر کہنے لگا۔

"اے میرے دولت کے درخت —— اے میرے خزانے کے بکس۔
اس وقت اندھیرے میں کچھ سونے اور چاندی کے سکّے پھینکو۔

جب سورج طلوع ہو تو ہزاروں اونس سونا پھینکو۔
اور جب شام ہو تو ہزاروں پونڈ چاندی پھینکو۔"

جوں ہی اس نے گانا بند کیا، بانس کے درخت سے سونا، چاندی اور قیمتی موتی نیچے گرنے لگے۔ یہ دیکھ کر چھوٹے لینگ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ جلدی جلدی یہ دولت اپنی جیبوں میں بھرنے لگا۔ اس طرح اس نے اپنی جیبیں سونے چاندی اور قیمتی موتیوں سے بھر لیں اور بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ راستہ بھر اس کا دل بلیوں اچھلتا رہا اور خوشی سے پاؤں زمین پہ نہ ٹکتا تھا۔ اس کے بعد یہ اس کا معمول بن گیا کہ جب بھی کتے کی قبر پہ آتا، پہلے یہی گانا گاتا —— اور جوں ہی گانا ختم کرتا اس کے ساتھ ہی بانس کے درخت سے سونا چاندی اور قیمتی موتی برستے جو وہ اپنی جیبوں میں بھر کے گھر لے آتا۔ یوں اس کے پاس بہت سی دولت جمع ہو گئی۔

جب اس بات کی خبر بڑے لینگ کو پہنچی کہ اس کے چھوٹے بھائی کے پاس بہت سی دولت جمع ہو گئی ہے تو بہت حیران ہوا۔ پہلے تو اسے اس بات کا یقین ہی نہیں آیا مگر جب وہ اس کے گھر پہنچا تو اس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا —— تاہم اب بھی وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اتنی جلدی اتنی دولت کیسے جمع کی جا سکتی ہے۔؟

اس نے چھوٹے لینگ سے پوچھا۔

"چھوٹے لینگ! تم نے یہ تمام دولت کہاں سے چرائی ہے ——؟"

"میں نے تو کوئی چوری نہیں کی —— میں نے کسی کی دولت نہیں چرائی ——!"

چھوٹے لینگ نے جلدی سے جواب دیا۔

"اگر چوری نہیں کی تو پھر یہ اتنی ساری دولت تمہارے پاس کہاں سے آ گئی؟"

بڑے بھائی نے اس طرح شک کے لہجے میں کہا جیسے اس نے چھوٹے لینگ کی چوری پکڑ لی ہو —— چھوٹا لینگ نیک دل تو تھا ہی، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی سیدھا سادا آدمی تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو بڑی ایمان داری سے بتا دیا۔

"میں نے اپنے کُتّے کی قبر پہ اُگے ہوئے بانس کو ہلا کر یہ دولت حاصل کی ہے"!

"کیا یہ تم سچ کہہ رہے ہو یا مجھے بے وقوف بنا رہے ہو —؟"

بڑے بھائی نے اس کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس پر چھوٹا یینگ بولا۔

"نہیں، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں — میں نے بانس کو ہلایا تو اس میں سے یہ دولت گری جو میں اُٹھا کر گھر لے آیا — اور اس طرح میں کئی بار دولت لایا ہوں"

بڑے یینگ نے یہ سُنا تو اس کا جی للچا گیا— وہ جلدی سے پوچھنے لگا۔

"کیا بانس کے درخت میں ابھی اور دولت بھی ہے —؟"

"یقیناً ہوگی!"

چھوٹے بھائی نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ اور پھر کہنے لگا۔

"اگر تم بھی دولت حاصل کرنا چاہتے ہو، تو جا کر اس بانس کو ہلاؤ — اس میں سے سونا، چاندی اور قیمتی موتی نیچے گریں گے"

"تم بانس کے درخت کو کس طرح ہلاتے ہو —؟"

بڑے یینگ نے اس سے سوال کیا — جواب میں چھوٹے بھائی نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ اس طرح جب میں کُتّے کی قبر پہ جاتا ہوں تو وہاں گاتا ہوں اور پھر بانس کے درخت کی شاخ پکڑ کر اسے ہلاتا ہوں تو دولت نیچے گرنے لگتی ہے — جوں ہی بڑے یینگ نے یہ بات سُنی، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسی وقت اپنے گھر پہنچا — وہاں سے دو ٹوکریاں لیں تاکہ ان میں دولت بھر سکے اور سیدھا کُتّے کی قبر کی طرف بھاگا — وہاں پہنچتے ہی اس نے بانس کے درخت کو بڑی مضبوطی سے پکڑ کر زور زور سے ہلانا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ گانے لگا — ابھی اس نے گانا شروع ہی کیا تھا کہ بے شمار چھوٹے چھوٹے تنگے، تتلیاں اور دوسرے اُڑنے والے کیڑے مکوڑے اس پہ گرنے لگے — وہ اس قدر تعداد میں گر رہے تھے کہ اس کا سر، چہرہ، ہاتھ اور سارا جسم ان سے ڈھک گیا — یہی نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں

کیڑے مکوڑے رینگ رینگ کر اس کے کپڑوں کے اندر چلے گئے اور اسے بُری طرح کاٹنے لگے ۔ وہ پریشانی اور گھبراہٹ میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا مگر مصیبت یہ تھی کہ پتنگے ہزاروں کی تعداد میں تھے اور اس کے سر سے لے کر پاؤں تک سارے جسم پر پھیل چکے تھے ۔ وہ ان کے تیز اور زہریلے ڈنکوں سے پریشان ہو کر زمین پر لوٹنیاں کھانے لگا ــــ اس وقت وہ شدید درد میں تلملا رہا تھا اور اس کے پورے جسم پر سخت کھجلی ہو رہی تھی ۔ وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اور دیوانوں کی طرح لوٹ رہا تھا ۔ اس طرح کافی دیر تک شدید کھجلی کے مارے تڑپتا رہا اور پھر جب اسے ذرا آرام ہوا تو غصّے میں اُٹھ کر سیدھا اپنے گھر کی طرف چل دیا ۔ گھر جا کر اس نے ایک بڑا سا چھرا لیا اور اُلٹے پاؤں پھر کُتّے کی قبر پر آگیا ۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔ غصّے میں آنکھیں سُرخ تھیں اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں ۔ اس نے آتے ہی چھرے سے بانس کا درخت جڑ سے کاٹ دیا اور واپس چلا گیا ۔

دوسرے روز چھوٹا یینگ حسبِ معمول اپنے کُتّے کی قبر پر گیا ۔ وہاں جا کر دیکھا تو بانس کا وہ درخت کٹا پڑا تھا جس سے اسے دولت حاصل ہوتی تھی ۔ بڑا پریشان ہوا مگر کیا کر سکتا تھا ــــ ؟ کچھ دیر تک وہاں کھڑا دل ہی دل میں افسوس کرتا رہا اور پھر کٹے ہوئے بانس کو کندھے پر اٹھا کر اپنے گھر کی جانب چل دیا ۔ وہ بانس اُٹھائے جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ بلند آواز میں گاتا جا رہا تھا ۔

"جب ہم نے اپنی جائیداد تقسیم کی تو میرے حصّے میں ایک کتا آیا ۔
اس نے میرے کھیت میں ہل چلانے میں میری مدد کی ــــ میں نے کبھی
اسے دھتکارا یا جھڑکی نہیں دی ۔
اب کسی نے میرے کُتّے کو جان سے مار دیا ہے ــــ میں اس کا دُکھ
کیسے برداشت کروں گا ؟
میرا دکھ بہت شدید ہے ــــ اور میں اپنے دُکھ کو چھپا نہیں سکتا ۔
میرے کُتّے کی قبر پہ بانس کا ایک درخت اُگا ۔

جو مجھے صبح کے وقت سونا اور شام کی شبنم میں چاندی دیتا تھا
میرے پیارے بانس کے درخت کو کس نے کاٹ دیا ہے ——؟
مجھ غریب کو یہ ایک نیا دُکھ کس نے دیا ہے ——؟"

اسی طرح افسوس کرتا ہوا وہ گھر آگیا —— گھر آکر اس نے چھرے سے بانس کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے کیے پھر ان ٹکڑوں کو پھاڑ کر ان سے مرغیوں کا ایک بڑا سا ٹاپا تیار کیا —— ٹاپا بنانے کے بعد اس نے اسے مکان کے باہر ایک کونے میں رکھ دیا۔ گاؤں میں عنقریب ایک میلہ لگنے والا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس موقع پر ٹاپا فروخت کر دے گا لیکن اس دوران میں ایک عجیب بات ہوئی —— وہ یہ کہ ادھر ادھر سے' پاس پڑوس کی بے شمار مرغیاں اور مادہ تیتر آئیں اور انھوں نے اس ٹوکرے میں انڈے دینے شروع کر دیے۔ اس طرح ایک ہی دن میں پورا ٹاپا انڈوں سے بھر گیا —— چھوٹے لینگ نے جب یہ دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ اس نے خوشی خوشی ٹاپا اُٹھایا اور انڈے بیچنے کے لیے بازار کی طرف چل دیا —— اس بات کی جب بڑے لینگ کو خبر ہوئی تو اسے بہت تعجب ہوا۔ وہ سوچنے لگا۔ چھوٹے لینگ کے پاس تو مرغیاں نہیں ہیں، پھر یہ اتنے سارے انڈے کہاں سے لے آیا ——؟ یہی کچھ معلوم کرنے کے لیے وہ چھوٹے بھائی کے پاس گیا اور اس سے دریافت کیا۔

"چھوٹے لینگ! تم نے یہ انڈے کہاں سے چوری کیے ہیں ——؟"

"میں نے یہ انڈے کہیں سے نہیں چُرائے!"

اس نے جواب دیا۔ اس پر بڑا لینگ بولا۔

"اگر چوری نہیں کیے تو پھر اتنے سارے انڈے تمھارے پاس کہاں سے آگئے ——؟ تمھارے پاس تو کوئی مرغی نہیں ہے ——؟"

اس کے اتنا دریافت کرنے پر چھوٹے لینگ نے ساری بات سچ سچ بتا دی۔ کہنے لگا۔

"میں نے بانس سے جو ٹاپا بنایا ہے، اسے میں نے گھر کے باہر رکھ دیا تھا ——

اِدھر اُدھر سے بہت سی مرغیاں اور مادہ تیتر آتی گئیں اور اس میں انڈے دیتی گئیں۔ اس طرح سارا ٹاپا ایک ہی دن میں انڈوں سے بھر گیا۔''

بڑا لینگ چھوٹے بھائی کی بات سُن کر بہت حیران ہوا ــــ اس کے دل میں لالچ آیا کہ یہ ٹاپا مجھے مل جانا چاہیے تاکہ مفت میں انڈے حاصل کر سکوں ــــ اس طرح میں روزانہ انڈے بیچ کر بہت سے پیسے کما سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے چھوٹے بھائی سے جھوٹا پیار جتاتے ہوئے کہا۔

''چھوٹے لینگ ــــ دیکھو میں تمھارا بڑا بھائی ہوں ــــ ایک مہینے کے لیے یہ ٹاپا مجھے اودھار دے دو تاکہ میں بھی کچھ پیسے کما لوں ــــ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مہینے کے بعد تمھیں ٹاپا واپس کر دوں گا ــــ!''

چھوٹا لینگ دل کا بہت اچھا تھا۔ اس نے انکار نہ کیا اور ٹاپا اپنے بھائی کو دے دیا ــــ بڑا لینگ دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا گھر آ رہا تھا کہ اب میں محنت کے بغیر پیسے کما سکوں گا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ٹاپے کو مکان کے پیچھے کے نیچے رکھ دیا اور خود چُھپ کر انتظار کرنے لگا کہ ابھی مرغیاں آتی ہیں، ابھی ٹاپا انڈوں سے بھر جائے گا۔ ابھی انتظار کرتے اسے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اس نے دیکھا، واقعی اودھر ادھر سے محلے کی بے شمار مرغیاں کُڑکُڑ کرتی آگئیں۔ ان کے ساتھ ہی بہت سی مادہ تیتر بھی پہنچ گئے ــــ وہ سب ٹاپے کے ارد گرد جمع تھیں اور باری باری ٹاپے میں جا جا کر باہر آ رہی تھیں۔ دوسری طرف ایک کونے میں چھپے ہوئے بڑے لینگ نے جب اس قدر مرغیاں اور مادہ تیتر دیکھے اور پھر یہ بھی دیکھا کہ مرغیاں باری باری ٹاپے میں جا کر باہر آ رہی ہیں تو اس سے زیادہ صبر نہ ہو سکا۔ انڈے حاصل کرنے کی خوشی میں زیادہ دیر تک اپنے آپ پہ قابو نہ رکھ سکا ــــ وہ بے صبری میں بھاگ کر ٹاپے کے پاس گیا کہ دیکھوں کتنے انڈے جمع ہوئے ہیں ــــ؟ مگر جوں ہی اس نے ٹاپے میں ہاتھ ڈالا اس کا سارا ہاتھ بیٹوں سے گندا ہو گیا ــــ وہاں ایک بھی انڈا نہیں تھا۔ صرف بیٹیں اس کا منہ چڑا رہی تھیں ــــ یہ دیکھ کر وہ غصّے میں تلملا گیا۔ جھنا کر ٹاپے کی

طرف بڑھا اور اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا — اس پر بھی جب اس کا غصّہ ٹھنڈا نہ ہوا تو اسے آگ لگا کر جلا دیا۔ اور اب ٹاپے کی بجائے وہاں تھوڑی سی راکھ پڑی تھی۔

دوسری جانب جب چھوٹے لینگ کو پتہ چلا کہ اس کے بھائی نے اس کا ٹاپا جلا دیا ہے تو وہ بہت افسردہ ہوا۔ بڑی مایوسی سے اپنے بھائی کے پاس گیا اور وہاں سے اپنے ٹاپے کی راکھ اکٹھی کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔ جب وہ راکھ لا رہا تھا تو راستہ بھر بلند آواز میں یہ گاتا آ رہا تھا۔

"جب ہم نے جائیداد تقسیم کی تو میرے حصّے میں ایک کُتّا آیا۔
اس نے میرے کھیت میں ہل چلانے میں میری مدد کی۔ میں نے کبھی
اسے دھتکارا یا جھڑکی نہیں دی۔
اب کسی نے میرے کُتّے کو مار دیا ہے — میں اس کا دُکھ کیسے برداشت
کروں گا —؟
میرا دُکھ بہت شدید ہے — اور میں اپنے دُکھ کو چھپا نہیں سکتا۔
میرے کُتّے کی قبر پہ بانس کا ایک درخت اُگا۔
جو مجھے صبح کے وقت سونا اور شام کی شبنم میں چاندی دیتا تھا۔
میرے پیارے بانس کے درخت کو کس نے کاٹ دیا ہے —؟
مجھ غریب کو یہ ایک نیا دُکھ کس نے دیا ہے —؟
میں نے اس بانس سے ایک ٹاپا تیار کیا تھا۔
جس میں مرغیاں اور مادہ تیتر انڈے دیتی تھیں۔
میرا ٹاپا کس نے جلا دیا ہے —؟ یہ ظلم کس نے کیا ہے —؟
اس نے مجھے اداس اور افسردہ کر دیا ہے۔"

اب چھوٹے لینگ کے پاس کچھ باقی نہیں رہا تھا — اس کا وہ کُتّا مر چکا تھا جو کھیت میں ہل چلانے میں اس کی مدد کرتا تھا — کُتّے کی قبر پہ اُگنے والا وہ بانس کا

درخت کٹ چکا تھا جس سے اسے دولت حاصل ہوتی تھی۔ بانس سے تیار کیا ہوا وہ ٹاپا جل چکا تھا جس کی وجہ سے وہ انڈے حاصل کرتا تھا ۔۔۔ غرض ہر چیز ختم ہو چکی تھی لیکن اس نے ہمّت نہ ہاری ۔۔۔ اس کا حوصلہ ابھی جوان تھا اور وہ محنت کرنا جانتا تھا۔ اس نے کسّی اور پھاوڑا اُٹھایا اور اپنی زمین پر چلا گیا تاکہ اسے فصل کے لیے تیار کرے۔ اس کی زمین کا ٹکڑا ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ جب ان کی جائیداد تقسیم ہوئی تھی تو اس کے بھائی نے یہ سوچ کر اسے زمین کا یہ ٹکڑا دیا تھا تاکہ وہ وہاں کچھ بھی نہ اُگا سکے۔ پہاڑی پر نہ پانی پہنچ سکتا تھا اور نہ کوئی فصل بوئی جا سکتی تھی۔ تاہم چھوٹے بینگ نے جی لگا کر محنت مشقت کی اور دن رات ایک کر کے فصل کے لیے کھیت تیار کر لیا۔ جب کھیت تیار ہو گیا تو اس نے اس میں لوکی کے بیج بو دیئے ۔۔۔ بیج بونے کے بعد اس نے اپنے ٹاپے کی راکھ بیجوں پر چھڑک دی اور واپس گھر آ گیا۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اس کا کھیت بڑی تیزی سے پھلا پھولا ۔۔۔ پہلے ہی دن بیج پھوٹ کر باہر آ گئے، دوسرے دن کونپلیں پتّوں میں تبدیل ہو گئیں، تیسرے روز بیلیں نظر آنے لگیں اور چوتھے روز بیلوں نے پھیل کر کھیت کی باڑیں ڈھک دیں۔ پھر پانچویں روز اس نے دیکھا تو ساری پہاڑی لوکی کے سنہرے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور جب چھٹا دن آیا تو بیلوں پر بڑی بڑی لوکیاں لگی نظر آ رہی تھیں۔ یوں تو تمام لوکیاں بڑی بڑی تھیں لیکن ان میں سے ایک بہت ہی بڑی تھی۔ یہ لوکی آٹھ نو فٹ تک لمبی اور بہت موٹی تھی ۔۔۔ اگر دو آدمی اپنے بازو پھیلا دیں تو پھر بھی اسے اپنے گھیرے میں نہ لے سکتے تھے۔ چھوٹا بینگ بہت خوش تھا۔ خاص طور پر بڑی لوکی دیکھ کر تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے اس لوکی کا نام "لوکیوں کا بادشاہ" رکھا تھا۔ واقعی وہ لوکیوں کا بادشاہ تھی بھی۔

اتفاق سے ایک بندر ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے جب اس قدر لوکیاں دیکھیں تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے وہاں سے ایک لوکی توڑی اور بھاگ گیا۔ اپنے غار میں پہنچ کر اس نے دوسرے بندروں کو بھی خبر کر دی کہ

"فلاں پہاڑی پر بے شمار لوکیاں لگی ہوئی ہیں ۔۔۔ جاؤ اور لے آؤ!"

چنانچہ جوں ہی رات ہوئی بے شمار بندر آئے اور کھیت کی آدھی لوکیاں توڑ کر لے گئے ـــ ادھر جب دوسرے روز چھوٹا یننگ کھیت میں گیا تو بڑا حیران ہوا ۔ اس کے کھیت کی آدھی لوکیاں کوئی چُرا لے گیا تھا ، بڑا پریشان تھا ۔ اسے تعجب بھی ہو رہا تھا کہ وہ کون آدمی ہے جو اس کی لوکیاں توڑ کر لے گیا ہے ـــ؟ بڑی سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی ۔ اس نے جوں توں کر کے دن تو گزارا اور پھر جوں ہی رات آئی وہ اپنے کھیت میں چلا گیا ۔ وہاں پہنچ کر اس نے سب سے بڑی لوکی میں شگاف کیا اور اسے اندر سے بالکل خالی کر دیا ۔ اس طرح لوکی ایک خول سا بن کر رہ گئی ۔ اس کے بعد وہ خود اس لوکی کے خول کے اندر داخل ہو کر چھپ گیا تاکہ آج رات کھیت کی نگرانی کرے اور یہ دیکھے کہ لوکیاں کون چُرا کر لے جاتا ہے ـــ؟ اس طرح چور کا بڑی آسانی سے پتہ چلایا جا سکتا تھا ۔ اور اب وہ اس بڑی لوکی کے اندر چھپا چور کے انتظار میں تھا۔

جب رات گہری ہو گئی تو پھر بندر ٹولیوں کی صورت میں آئے اور لوکیاں توڑنے لگے ۔ انھوں نے کھیت کی باقی تمام لوکیاں بھی توڑ لیں لیکن جب سب سے بڑی لوکی اُٹھانے لگے تو وہ بہت زیادہ بھاری تھی ۔ ایک تو لوکی بہت بڑی تھی اور دوسرا اس میں چھوٹا یننگ بھی چھپا ہوا تھا اس لیے اسے اُٹھا لے جانا ان کے بس میں نہ تھا مگر بندر لالچ کی وجہ سے اسے چھوڑ کر بھی نہیں جانا چاہتے تھے ۔ ان سب نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر طے پایا کہ ۔

" اس بڑی لوکی کو لے جانے کے لیے اپنی محافظ پری کی مدد حاصل کی جائے !"

انھوں نے اسی وقت ایک چھوٹے بندر کو اپنے غار کی طرف دوڑایا ۔ وہ بھاگا بھاگا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گیا ۔ اس کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے کپ تھے ۔ بندروں نے وہ کپ اس بڑی لوکی کے سامنے رکھے ـــ ایک سُرخ موم بتی جلائی اور اپنی محافظ پری کو بُلانے کے لیے اس پہ سوئی ماری ۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب مل کر التجائیں کرنے لگے ۔

" اے ہماری محافظ پری ـــ! آسمان سے اُتر کر نیچے آ اور ہماری مدد کر !"

چھوٹا یینگ لوکی میں چھپا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب بندر اپنے دھیان میں مست اس طرح التجائیں کر رہے تھے، عین اس وقت اس نے شور کر دیا۔

"ہوئے ___ ہوئے ___ ہوئے ___!"

بندر اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ لوکی میں کوئی آدمی چھپا ہوا ہے۔ وہ یہ سمجھے کہ یہ شور بڑی لوکی نے کیا ہے۔ سب کے سب خوف زدہ ہو گئے اور اپنے سونے چاندی کے کپ وہیں چھوڑ چھاڑ کر ہوا ہوا کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔

جب تمام بندر وہاں سے بھاگ گئے اور ان کا شور ختم ہو گیا تو چھوٹا یینگ لوکی سے باہر نکلا۔ اس نے سونے اور چاندی کے کپ اُٹھائے اور اپنے گھر لے آیا۔ ___ ادھر دوسرے روز جب بڑے یینگ کو اس بات کی خبر ہوئی کہ اس کے چھوٹے بھائی کے پاس سونے چاندی کے کپ ہیں تو وہ بھاگم بھاگ اس کے پاس گیا اور پوچھنے لگا۔

"چھوٹے یینگ ___! تم نے یہ قیمتی کپ کہاں سے چُرائے ہیں ___؟"

"میں نے یہ کہیں سے نہیں چُرائے!"

اس نے جواب دیا۔

"یہ تو رات مجھے اپنے کھیت میں سے ملے ہیں"

اس کے بعد چھوٹے یینگ نے اپنی پوری کہانی سُنائی کہ کس طرح وہ اپنے ٹاپے کی راکھ اُٹھا لایا تھا ___ اس نے اپنے کھیت میں لوکیاں بوئیں تو بیجوں پر یہ راکھ ڈال دی ___ پھر پانچ چھ روز ہی میں بیلیں بڑی ہو گئیں اور ان پر لوکیاں لگ گئیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح کھیت میں ایک بہت بڑی لوکی پیدا ہوئی۔ جب ایک رات اس کی لوکیاں چوری ہو گئیں تو وہ دوسری رات چور کو پکڑنے کے لیے اس میں چھپ گیا ___ پھر کس طرح بندر آئے اور اس کے شور کرنے پر اپنے سونے چاندی کے کپ وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے جو وہ اپنے گھر لے آیا۔

بڑے یینگ نے یہ سارا قصّہ سُنا اور خاموشی سے اپنے گھر چلا آیا ___ وہ دن

بھر سوچتا رہا اور پھر جیسے ہی رات ہوئی چپکے سے گھر سے نکلا اور چھوٹے یینگ کے کھیت میں چلا گیا ـــ وہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے بڑی لوکی کو تلاش کیا۔ وہ لوکی ابھی تک وہیں پڑی تھی۔ بڑے یینگ نے اسے دیکھا تو جلدی سے اس میں داخل ہو کر بیٹھ گیا ـــ اور انتظار کرنے لگا کہ بندر آئیں تو وہ ان سے سونے چاندی کے کپ حاصل کرے۔

جوں ہی رات گہری ہوئی اس کے ساتھ ہی بندروں کی ٹولیوں کی ٹولیاں کھیت میں پہنچ گئیں ـــ آج وہ بہت زیادہ تعداد میں آئے تھے اور اپنے ساتھ سونے چاندی کے کپ بھی نہیں لائے تھے۔ کھیت میں پہنچتے ہی بہت سے بندروں نے مل کر اس بڑی لوکی کو اُٹھا لیا اور اسے لے کر اپنے غار کی طرف چل دیئے۔ گو لوکی آج بھی بہت بھاری تھی مگر بہت سے بندروں نے مل کر اسے اُٹھا رکھا تھا اور کسی نہ کسی طرح اسے لیے جا رہے تھے۔ بڑا یینگ لوکی کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑے راستے کے بعد اسے اندر بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی اور وہ سو گیا۔

بندر اونچے نیچے راستوں پر چل رہے تھے اور اب وہ ایک پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ گھاٹیوں اور ڈھلانوں میں سے گزرتے ہوئے ان کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے مگر وہ لوکی کو مضبوطی سے تھامے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک جگہ جب بہت مشکل گھاٹیاں آئیں تو وہ لوکی کو لڑھکاتے ہوئے لے جانے لگے۔ جیسے ہی انھوں نے لوکی کو لڑھکانا شروع کیا، لوکی کے اندر سویا ہوا بڑا یینگ جاگ پڑا۔ جب وہ ایک عمودی چٹان پر سے گزر رہے تھے تو بہت زیادہ شور کرنے لگے۔ اس موقع پر بڑے یینگ نے سوچا:

"یقیناً اس وقت بندر اپنی محافظ پری کو بُلا رہے ہیں ـــ یہی وقت ہے انھیں بھگانے کا ـــ!"

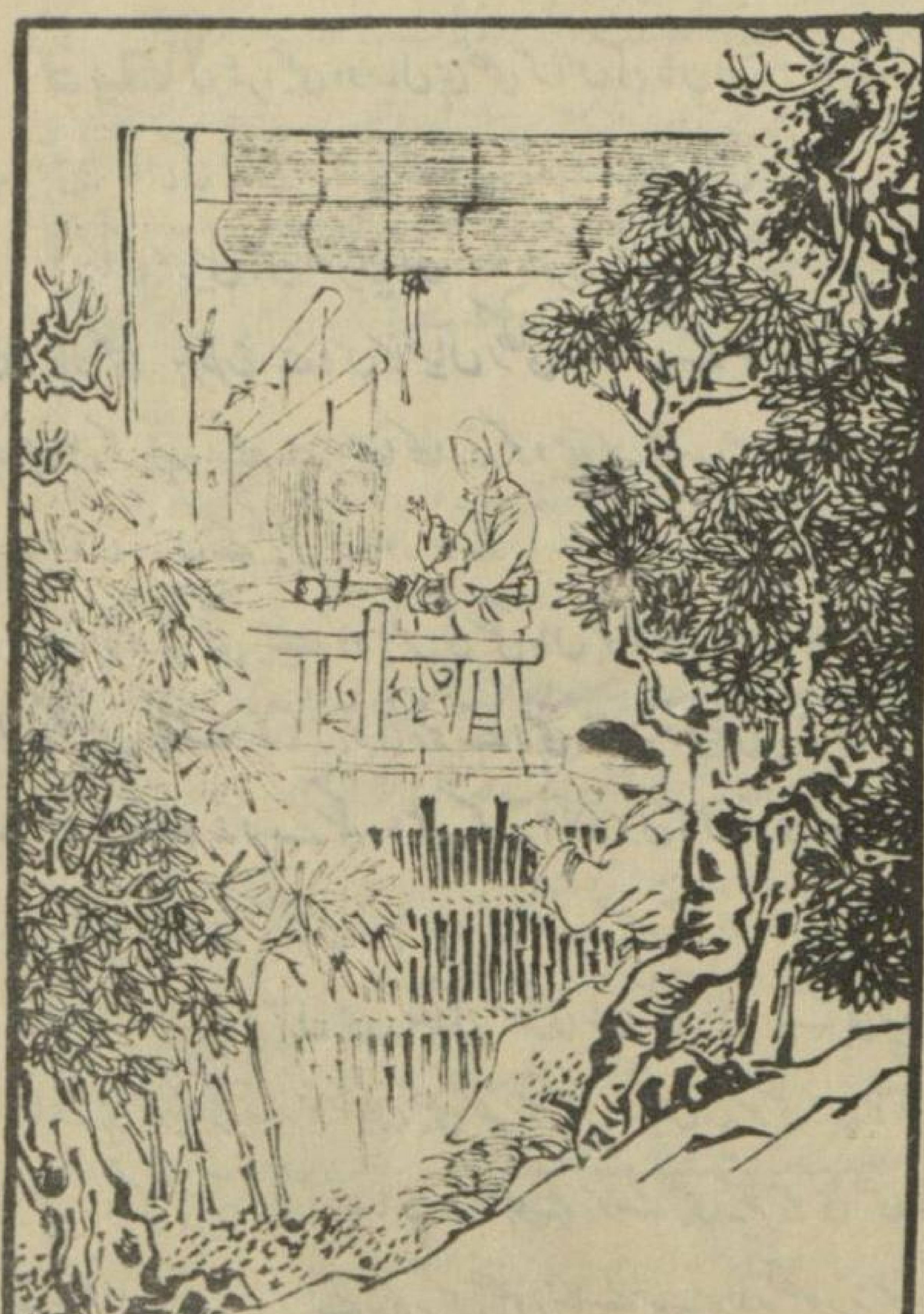
اس کے ساتھ ہی اس نے ہوئے ہوئے کا شور کرنا شروع کر دیا ـــ اس کا شور کرنا تھا کہ بندر سمجھے، آج پھر بڑی لوکی شور کر رہی ہے لہٰذا انھوں نے گھبرا کر لوکی

کو چٹان سے نیچے کی طرف لڑھکا دیا اور خود اپنے غار کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

لو کی چٹان سے نیچے کی جانب لڑھکتی آرہی تھی ــــ پتھروں سے ٹکراتی ہوئی تیز سے تیز تر رفتار سے زمین کی طرف آرہی تھی ــــ چند ہی لمحوں بعد وہ لڑھکتی ٹکراتی پہاڑ کے نیچے آکر دھڑام سے گر پڑی ــــ مگر یہاں تک آتے آتے اور پھر نیچے گرنے کی وجہ سے پاش پاش ہو گئی ــــ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو کر دور دور تک بکھر گئے ــــ اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر لیٹا ہوا بڑا لینگ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔

سوتیلی ماں، سوتیلی بہن

DAKA AND DALUN



ڈیکا کی عمر ابھی دو سال ہی تھی کہ اس کی ماں اللہ کو پیاری ہوگئی —— اور جب وہ تین سال کی ہوئی تو اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی۔

ڈیکا کی سوتیلی ماں گھر میں آئی تو وہ گھر کی مالکہ تھی۔ شروع شروع میں وہ ڈیکا پر بڑی مہربان تھی۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی —— اس کے کھانے پینے اور کپڑے لتّے کی دیکھ بھال کرتی۔ اچھے سے اچھا کھانے کو دیتی اور خوب صورت سے خوب صورت کپڑے پہناتی۔ اس کے کھیل کود اور سونے جاگنے پر توجہ دیتی۔ حقیقت یہ تھی، وہ ڈیکا سے اسی طرح پیار کرتی تھی جیسے وہ اس کی سگی ماں ہو لیکن دن پھرتے دیر نہیں لگتی اور ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ہونی ہو کے رہتی ہے۔ ڈیکا کی یہ خوش قسمتی زیادہ عرصے تک اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اس کے یہ اچھے دن اس آدمی کی طرح تھے جو چند لمحوں کے لیے بادشاہ بن کر اسٹیج پہ آجائے اور جب سین ختم ہونے پہ پردہ گرے تو پھر ویسے کا ویسا ہو جائے۔ جوں ہی ڈیکا کی سوتیلی ماں کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی، اس کے ساتھ ہی ڈیکا کی تمام خوشیاں بھی ختم ہوگئیں۔ اس کی سوتیلی بہن کا نام ڈیلین تھا اور اب ڈیلین ماں کی چہیتی اور ڈیکا باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہوگئی تھی —— اسے بات بات پہ جھڑکیاں ملتیں، اس کے ہر کام میں نقص نکالے جاتے اور قصور نہ ہونے پہ بھی مارا پیٹا جاتا۔ وہی ماں جو شروع میں اس کے لیے مہر و محبت کا سایہ تھی اب اس کی جان کی

دشمن ہو گئی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن ڈیلین گو ابھی چھوٹی تھی لیکن وہ اپنی ماں کی وجہ سے گھمنڈ میں رہتی تھی۔ ڈیکا سے عمر میں چھوٹی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھتی تھی اور اس پہ رعب ڈالتی تھی۔ وہ ڈیکا کے لیے ماں سے زیادہ ظالم نہ سہی لیکن اس سے کچھ کم بھی نہ تھی۔

کہتے ہیں کہ بدقسمتی کبھی اکیلی نہیں آتی۔ ڈیکا کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہ تھی کہ اس کا باپ بھی اللہ کو پیارا ہو گیا —— اور اب مصیبتیں تھیں اور بے چاری ڈیکا —— اگرچہ اس کا باپ سگی ماں کے مرنے کے بعد اس کا کبھی خیال نہ کرتا تھا مگر پھر بھی ڈیکا کو ایک سہارا تھا کہ اس کا بھی باپ موجود ہے —— اب جوں ہی باپ کو بھی موت نے چھین لیا تو اس کی سوتیلی ماں کا برتاؤ اور بھی ظالمانہ ہو گیا۔ وہ اس کو بُرے سے بُرا کھانے کو دیتی اور خراب سے خراب پھٹے پرانے کپڑے پہننے کو دیتی۔ اس کے برعکس ڈیلین کے لیے نت نئے کپڑے سلتے اور اچھے سے اچھا کھانا پکایا جاتا۔ اس کی ہر طرح سے دیکھ بھال ہوتی اور اس کی ہر خوشی کو مقدم سمجھا جاتا —— دوسری طرف ڈیکا کو اتنی اجازت بھی نہ تھی کہ وہ اس کا بچا کھچا ہی کھا لے یا اس کی کسی چیز کو چھو کر دیکھ لے۔

دن بیتتے گئے اور وقت دبے پاؤں آگے بڑھتا رہا۔ اب ڈیکا ایک حسین و جمیل اور نوجوان لڑکی تھی۔ اسے اللہ نے حسن بھی جی بھر کے دیا تھا اور جوانی نے بھی اس پہ اپنے سارے رنگ لٹا دیئے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کوئی شہزادی ہو۔ جو بھی ایک نظر اسے دیکھ لیتا دنگ رہ جاتا۔ اس کے برعکس ڈیلین ایک بدشکل لڑکی تھی۔ اسے اللہ نے نہ نین نقش دیئے تھے اور نہ جسم کی خوب صورتی سے نوازا تھا —— اس پہ چہرے پہ چیچک کے بدنما داغ اس کی بدصورتی میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ گاؤں میں شادی کی ایک تقریب تھی۔ ڈیکا کی سوتیلی ماں نے اپنی بیٹی کو نہلایا دھلایا اور پھر اسے خوب صورت کپڑے پہنائے تاکہ جب وہ شادی میں شریک ہو تو ہر شخص کی اس پہ نظر پڑے۔ ڈیکا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب اس کی ماں نے اپنی سگی بیٹی کا سنگھار کر کے اسے خوب سجا بنا دیا اور وہ شادی میں شریک ہونے کے لیے جانے لگی تو ڈیکا نے ڈرتے ڈرتے ماں سے کہا۔

"ماں! مجھے بھی اپنی بہن کے ساتھ شادی میں جانے کی اجازت دے دو ـــــ؟
میں بھی اس کے ساتھ شادی میں جاؤں گی ـــــ؟"

اس کی ماں تو پہلے ہی اس کے حُسن سے جلتی تھی، پھر بھلا وہ اسے کیسے جانے کی اجازت دے دیتی ـــ؟ اس نے ڈیکا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تم بھی شادی میں جاؤ گی ـــ؟ بے وقوف لڑکی اگر تم بھی شادی میں چلی جاؤ گی تو پھر گھر کا کام کاج کون کرے گا ـــ؟ ابھی سارا کام اسی طرح پڑا ہے۔ تم کام ختم کیے بغیر کیسے جا سکتی ہو؟"

اتنا کہہ کر اس نے غصّے میں ڈیکا کی طرف دیکھا اور پھر چلّا کر بولی۔

"اگر تم سارا کام ختم کر لو تو میں تمھیں جانے کی اجازت دے دوں گی، ورنہ خاموشی سے یہاں بیٹھ کر کام کرو ـــ تمھارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں!"

اس کے بعد اس نے پانچ بادیئے تلوں سے بھر کر ایک جگہ ڈھیر کر دیئے ـــ پھر چھ بادیئے سویابین کے بھرے اور انھیں تلوں میں ملا دیا۔ جب وہ تل اور سویابین آپس میں مل چکے تو ڈیکا کو مخاطب کرتے ہوئے ڈانٹ کر بولی۔

"اگر تم یہ سارے تل اور سویابین الگ الگ کر لو تو میں تمھیں شادی میں جانے کی اجازت دے دوں گی ورنہ نہیں!"

اس نے اتنا کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

ڈیکا نے بڑی مایوسی اور حسرت سے اپنے سامنے ڈھیر ہوئے تلوں اور سویابین کو دیکھا جو ایک دوسرے میں ملے ہوئے تھے ـــ وہ جان گئی کہ اب وہ شادی میں شریک نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ تل اور سویابین الگ الگ کرنا چند گھنٹوں کا کام نہیں تھا۔ وہ تو دس روز میں بھی جدا جدا نہ ہو سکتے تھے۔ اسے اپنی بدقسمتی پر رونا آگیا مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی ـــ؟ اگر انھیں الگ الگ نہ کرتی تو ماں اسے اور بھی مارتی۔ پہلے ہی کیا کم پیٹتی تھی جو وہ اپنے لیے ایک اور وجہ پیدا کر لیتی اور مزید پٹائی کا شکار ہوتی ـــ یہی کچھ سوچ کر وہ اپنی بے بسی پر تڑپ اُٹھی ـــ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور وہ سسکیاں لے لے

کر رونے لگی۔ وہ اتنی سسکیاں لے رہی تھی کہ اس کی گھگھی بندھی جا رہی تھی۔

ڈیکا کے رونے کی آواز سُن کر اس کی مری ہوئی سگی ماں کی روح تڑپ اُٹھی ـــ اس سے اپنی معصوم بیٹی کا رونا دیکھا نہ گیا ـــ اس نے اسی وقت کوّے کا روپ دھار لیا۔ پھر کوّا اُڑ کر گھر کی منڈیر پہ آکر بیٹھ گیا اور گانے لگا۔

"میری پیاری ڈیکا ـــ میری پیاری ڈیکا

رو نہیں ـــ پریشان مت ہو

تلوں اور سویابین کو الگ الگ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے

لو میں بتاؤں کہ تمھیں کیا کرنا چاہیے

ایک چھلنی لو ـــ تلوں اور سویابین کو اس میں ڈال کر خوب ہلاؤ

پھر تم دیکھوگی کہ تل الگ ہو جائیں گے اور سویابین الگ۔"

ڈیکا نے جب کوّے کا گانا سُنا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔ وہ اسی وقت اُٹھی اور بھاگی بھاگی گھر کے اندر گئی۔ چھلنی لائی اور ملے ہوئے تل اور سویابین چھلنی میں ڈال کر چھاننے لگی۔ اس نے دیکھا واقعی تل الگ ہوتے جا رہے تھے اور سویابین الگ۔ چند ہی لمحوں میں اس نے سارے تل اور سویابین الگ الگ کر دیئے تھے۔ وہ بھاگی بھاگی اپنی سوتیلی ماں کے پاس گئی اور خوش ہو کر کہنے لگی۔

"ماں! میں نے سارے تل اور سویابین الگ کر دیئے ہیں ـــ کیا اب میں شادی میں جا سکتی ہوں؟"

اس کا خیال تھا کہ اب اس کی ماں اسے شادی میں جانے کی اجازت دے دے گی مگر اس کی ماں یہ سُن کر بڑی حیران ہوئی کہ تل اور سویابین الگ ہو گئے ہیں ـــ؟ اس نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور جھنک کر بولی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ـــ؟ کیا تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو ـــ؟"

"ماں! تم خود دیکھ سکتی ہو، میں نے سارے تل اور سویابین الگ کر دیئے ہیں!"

ڈیکا نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا — اس کی ماں کو بڑا تعجب تھا کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے —؟ یہ کام تو وہ دس دنوں میں بھی نہیں کر سکتی تھی — اس کے ذہن میں ایک وہم نے جنم لیا — اس نے سوچا۔

"کہیں یہ لڑکی کوئی ڈائن تو نہیں —؟"

پھر اس نے ڈیکا کو قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے غصے میں پوچھا۔

"کیا تم نے واقعی سارے تل اور سویابین الگ کر دیئے ہیں —؟"

جواب میں ڈیکا پھر اسی سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

"ہاں ماں! میں نے الگ الگ کر دیئے ہیں!"

اس پر اس کی ماں اسے ایک طرف کو دھکیلتے ہوئے کہنے لگی۔

"نہیں، یہ کام اتنا آسان نہیں ہے — تم جھوٹ بول رہی ہو —!"

اس کے بعد اس نے ڈیکا کو دو خالی گھڑے دیتے ہوئے کہا۔

"جاؤ پہلے چشمے سے گھڑے بھر کے لاؤ اور صحن میں رکھے ہوئے پانی کے تینوں برتن بھرو — اس کے بعد میں تمھیں شادی میں جانے کی اجازت دوں گی —!"

ڈیکا نے دل میں سوچا، یہ تو بہت آسان کام ہے — میں ابھی چشمے سے گھڑے بھر لاتی ہوں اور چند ہی پھیروں میں صحن کے تینوں برتن بھر دوں گی — اس نے اپنی آستینیں چڑھائیں اور گھڑے لے کر قریب ہی کے چشمے پر جا پہنچی مگر جب وہ ایک گھڑا لے کر چشمے سے پانی بھرنے لگی تو اس نے دیکھا، چشمے کا پانی بہت نیچے تھا۔ اس تک اس کا ہاتھ جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا — اس نے اپنے طور پر بہتیری کوشش کی، چشمے میں جھک کر گھڑا بھرنا چاہا لیکن سب بے سود — وہ بار بار کوشش کرتی اور بار بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی اور اس کے دونوں گھڑے ابھی تک خالی کے خالی تھے۔ ڈیکا کوشش کرتے کرتے تھک گئی اور اسی مایوسی کے عالم میں چشمے کے کنارے بیٹھ گئی — خالی گھڑے لے کر واپس گھر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اگر ایسا کرتی تو ماں اسے پیٹنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتی —

قدم قدم پہ بدقسمتی اس کے ساتھ تھی۔ وہ بے بسی میں اپنے آنسو نہ روک سکی اور سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگی۔

دوسری طرف ڈیکا کی ماں کی روح نے جب اس کی سسکیاں سُنیں تو وہ بے چین ہو گئی۔ اس سے اپنی پیاری بیٹی کی بے بسی دیکھی نہ گئی ۔ اس نے پھر کوّے کا روپ دھارا ۔ کوّا اُڑا اور چشمے کے قریب ہی ایک درخت پہ بیٹھ کر گانے لگا۔

" میری پیاری ڈیکا ۔ میری پیاری ڈیکا
رو نہیں ۔ پریشان مت ہو
چشمے سے گھڑے بھرنا کوئی مشکل کام نہیں
پہلے چشمے کو گھاس اور مٹی سے بھر دو
اور پھر تم آسانی سے پانی بھر سکوگی "

جوں ہی ڈیکا نے کوّے کا گانا سُنا وہ خوش ہو گئی ۔ اس نے اسی طرح کیا جیسے کوّے نے بتایا تھا اِدھر اُدھر سے گھاس اکٹھی کی، مٹی جمع کی اور اسے چشمے میں بھر دیا ۔ اس طرح چشمے کا پانی اوپر آ گیا اور اس نے آسانی سے اپنے دونوں گھڑے بھر لیے ۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں گھر کے صحن میں رکھے ہوئے پانی کے بڑے برتن بھی بھر دیئے اور دونوں گھڑوں کو بھی بھر کے لے آئی ۔ اس کے بعد وہ خوشی خوشی جلدی سے اپنی سوتیلی ماں کے پاس گئی اور کہا۔

" ماں ! میں نے سارا پانی بھر دیا ہے ۔ اب مجھے شادی میں جانے کی اجازت دے دو ۔ ؟"

ظالم سوتیلی ماں کا دل اب تک نہ پسیجا تھا۔ اس نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

" تم شادی میں کیسے جا سکتی ہو ۔ ؟ تمھارے پاس تو نئے کپڑے ہی نہیں ہیں ؟"

پھر وہ اپنی سگی بیٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی ۔

" اپنی بہن کو دیکھو ۔ اس کے پاس نئی سُرخ قمیص اور نئی نیلی شلوار ہے ۔ اس کے جوتے خوب صورت ہیں ۔ اور بے داغ نئی جرابیں پہنے ہوئے ہے ۔ اور تم

اپنے آپ کو دیکھو ــــ تمہارے کپڑوں میں جگہ جگہ تھگلیاں لگی ہوئی ہیں ــــ اگر تم اس حالت میں شادی میں شریک ہوگی تو مہمان سے کہیں زیادہ فقیرنی دکھائی دوگی !"

اس نے اتنا کہا اور ڈیکا کو اکیلا چھوڑ کر گھر کے اندر چلی گئی۔ ڈیکا بے چاری تو یہ سوچے ہوئے تھی کہ اب اسے شادی میں جانے کی اجازت مل جائے گی لیکن جب اس کی ظالم سوتیلی ماں اب بھی اسے اجازت دینے پر راضی نہ ہوئی تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ جس جگہ کھڑی تھی وہیں سسکیاں بھرنے اور رونے لگی۔

ڈیکا کی سگی ماں کی روح نے جب اسے اس طرح سسکیاں لیتے اور روتے دیکھا تو اس کی ممتا تڑپ اٹھی۔ اس نے پھر کوّے کا روپ دھارا ــــ کوّا اڑا اور مکان کی منڈیر پر بیٹھ کر گانے لگا۔

"میری پیاری ڈیکا ــــ میری پیاری ڈیکا
رو نہیں ــــ پریشان مت ہو
جاؤ اور لوکاٹ کے درخت کی جڑیں کھودو
تمھیں وہاں نئے کپڑے، نئے جوتے اور نئی جرابیں ملیں گی"۔

کوّے کی یہ بات سن کر ڈیکا اس قدر خوش ہوئی کہ ناچنے لگی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے اسی وقت ایک پھاوڑا لیا اور لوکاٹ کے پیڑ کی جڑوں میں کھودنا شروع کر دیا۔ ابھی تھوڑی سی زمین کھدی تھی کہ اس نے دیکھا، ایک چھوٹا سا بنڈل برآمد ہوا جسے دیکھ کر ڈیکا کی خوشی کی حد نہ تھی۔ اس نے جلدی جلدی اسے کھولا تو اس میں ایک خوب صورت گاؤن، ایک سلک کی سرخ شلوار جس کے پائنچوں پر لیس لگی ہوئی تھی، نئے جوتوں کا ایک جوڑا، اور اس کے ساتھ سونے کی چوڑیوں اور سونے کی بالیوں کا ایک ایک جوڑا تھا۔ ڈیکا یہ سب کچھ دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ وہ جلدی سے بنڈل گھر میں لائی اور کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ اس نے نئے کپڑے اور نئے جوتے پہنے۔ سونے کی نئی چوڑیاں اور بالیاں پہنیں اور پھر بھاگی بھاگی اپنی ماں کے پاس گئی۔

"ماں! دیکھو، میں نے کپڑے اور نئے جوتے پہن لیے ہیں ــــ میری جرابیں بھی نئی

ہیں۔ چوڑیاں اور بالیاں بھی نئی ہیں ۔۔۔ اب مجھے بھی شادی میں جانے کی اجازت دو ۔ ؟"

ڈیکا کی سوتیلی ماں نے جب اسے اس طرح نئے کپڑوں میں ملبوس دیکھا تو جل بھن کر کوئلہ ہوگئی ۔۔ وہ بڑی پریشان ہوئی کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا ۔۔ ؟ یہ خوب صورت نئے کپڑے اور سونے کے زیور کہاں سے آگئے ۔۔۔ ؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ۔۔ وہ بڑی تلملائی مگر اب اس کے پاس اور کوئی بہانہ نہ تھا۔ آخر مجبور ہوکر اسے ڈیکا کو شادی میں جانے کی اجازت دینا ہی پڑی ۔

ڈیکا کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی شادی میں شریک ہونے کے لیے جارہی تھی۔ اس نے آج تک اس قسم کی دعوت میں جاکر نہ دیکھا تھا۔ نہ تو اسے کبھی کوئی ساتھ لے جاتا تھا اور نہ جانے کی اجازت ملتی تھی ۔۔۔ آج جب اسے شادی میں شرکت کی اجازت مل گئی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی ۔۔۔ وہ راستے میں ناچتی اور اچھلتی کودتی جارہی تھی ۔۔۔ جب وہ ایک پل پر سے گزر رہی تھی تو اچانک اس کا پاؤں ایک پتھر سے پھسل گیا ۔۔ پاؤں کا پھسلنا تھا کہ اس کا ایک جوتا لڑھک کر دریا میں جاگرا۔ اس نے اسے پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر جوتا ہاتھ نہ آسکا ۔۔۔ اور وہ اسے وہیں چھوڑ کر آگے چل دی ۔

اتفاق سے اسی وقت پیچھے پیچھے ایک نوجوان گھوڑے پر سوار آرہا تھا ۔۔ اس نوجوان کا نام ہیسو تسانی تھا۔ جب وہ پل پر پہنچا تو اس کا گھوڑا خود بخود وہاں ٹھہر گیا۔ اس نے اسے آگے بڑھانے کے لیے ایڑ لگائی مگر گھوڑا ہنہنا کر وہیں کا وہیں کھڑا رہا ۔۔۔ ہیسو تسانی حیران تھا کہ گھوڑا اس طرح کیوں رک گیا ہے۔ ؟ اس نے اپنے دل میں سوچا ۔

"گھوڑا بغیر کسی وجہ کے اس طرح رک نہیں سکتا ۔۔ ضرور کوئی بات ہے !"

اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور ادھر ادھر گرد کا جائزہ لیا ۔۔ اچانک اس نے دیکھا، دریا میں ایک جگہ ریت پر کسی عورت کا خوب صورت سرخ جوتا پڑا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر آیا اور اسے پل کے ساتھ بنے ہوئے جنگلے سے باندھ کر خود دریا میں جاکر جوتا اٹھا لیا۔ سرخ رنگ کا یہ جوتا انتہائی خوب صورت

تھا۔ ہسیو تسائی نے سوچا۔

"جس عورت کا جوتا اتنا خوب صورت ہے وہ خود کتنی حسین و جمیل ہوگی —؟"

پھر وہ جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"کیا اس لڑکی سے میری شادی ہو سکتی ہے جس کا یہ جوتا ہے —؟"

اس نے اپنے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، میں اس لڑکی سے ضرور شادی کروں گا جس کا یہ جوتا ہے۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات گاؤں بھر میں پھیل گئی — لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس طرح ہسیو تسائی کو دریا سے ایک خوب صورت جوتا ملا ہے اس کے ساتھ ہی اس بات کے چرچے بھی ہونے لگے کہ ہسیو تسائی اس لڑکی سے شادی کرے گا جس کا یہ جوتا ہے — ڈیلکا ان باتوں سے بالکل بے خبر تھی لیکن اس کی سوتیلی ماں کے کانوں تک یہ تمام باتیں پہنچ گئی تھیں — اس نے جب یہ سنا کہ ہسیو تسائی اس لڑکی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے جس کا یہ جوتا ہے تو وہ اسی وقت بھاگی بھاگی پل پہ گئی — وہاں پہنچ کر اس نے ہسیو تسائی سے کہا۔

"یہ جوتا میری بیٹی ڈیلن کا ہے —!"

ہسیو تسائی اسے غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

"میں کیسے یقین کر لوں کہ واقعی یہ جوتا اسی کا ہے —؟"

"میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ جوتا میری بیٹی ڈیلن کا ہے۔"

وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولی مگر آگے سے ہسیو تسائی نے جواب دیا۔

"اچھا! تم اپنی بیٹی کو یہاں لاؤ تاکہ وہ اس بات کی تصدیق کرے —؟"

اس پہ ڈیلن کی ماں جلدی سے کہنے لگی۔

"وہ اس وقت ایک شادی میں شریک ہے لیکن چند منٹ میں یہاں پہنچنے والی ہے — شادی کی تقریب ختم ہو چکی ہوگی اور وہ اب آتی ہی ہوگی۔"

ڈیلن کی ماں نے اس سے کہا اور دونوں پل پہ ڈیلن کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی

انھیں انتظار کرتے چند لمحے ہی بیتے ہوں گے کہ دوسری طرف سے ڈیکا اور ڈیلین آتی دکھائی دیں جب وہ دونوں قریب آگئیں تو ڈیلین کی ماں نے اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہسیوتسائی سے کہا۔

"دیکھو ــــ وہ میری بیٹی آرہی ہے ــــ وہ جس نے سُرخ قمیص اور نیلی شلوار پہن رکھی ہے ــــ اسی کا یہ جوتا ہے"

پھر وہ جلدی سے آگے بڑھی اور ڈیلین کے پاس جاکر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پیار سے بولی۔

"ڈیلین بیٹی! تمھارا کھویا ہوا جوتا اس نوجوان کے پاس ہے ــــ جلدی جاؤ اور اس سے اپنا جوتا مانگو ــــ؟"

عین اس وقت ڈیکا کی نظر پڑی تو اس نے دیکھا کہ اس نوجوان کے پاس جو جوتا ہے وہ تو اس کا ہے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھ کر نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"یہ جوتا میرا ہے ــــ ازراہ کرم مجھے واپس کر دیجیے ــــ؟"

اس کی سوتیلی ماں بھلا یہ کیونکر برداشت کرسکتی تھی کہ ہسیوتسائی کی شادی ڈیکا سے ہوجائے ــــ؟ وہ لپک کر آگے بڑھی اور ڈیکا کو ڈانٹ کر بولی۔

"یہ جوتا تو ڈیلین کا ہے!"

اس کے ساتھ ہی اس نے ڈیکا کے ایک چانٹا رسید کیا اور پھر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگی۔

"بے وقوف لڑکی ــــ! یہ جوتا تمھارا کیسے ہوگیا ــــ؟ یہ تو ڈیلین کا ہے ــــ؟"

اب عالم یہ تھا کہ ڈیکا کہتی جوتا میرا ہے اور اس کی سوتیلی ماں کا کہنا تھا، جوتا ڈیلین کا ہے۔ دونوں اسی طرح اُلجھی ہوئی تھیں اور ہسیوتسائی سوچ رہا تھا کہ اس جھگڑے میں صحیح لڑکی کا پتہ کیونکر چلایا جائے ــــ؟ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی مگر پہلے جھگڑا تو ختم ہو ــــ؟ اس نے دونوں کو خاموش کرنے کے لیے چلّا کر کہا۔

"خدا کے لیے یہ جھگڑا بند کرو!"

جب وہ دونوں خاموش ہوگئیں تو وہ ان سے کہنے لگا ۔

"تم کہتی ہو کہ جوتا میرا ہے اور دوسری کا کہنا ہے ، جوتا اس کا ہے ۔ اگر تم اس طرح پورا سال بھی بحث کرتی رہوگی تو کوئی فیصلہ نہ ہو سکے گا ۔ تو میں تمھیں ایک تجویز بتاتا ہوں ۔ اس طرح معاملہ خود بخود صاف ہو جائے گا ۔"

"ہاں —— ہمیں منظور ہے —— وہ کون سی تجویز ہے ——؟"

ڈیکا نے جلدی سے جواب دیا جب یہ ہسیو تسائی نے ڈیلین اور ڈیکا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

"میں ایک جھاڑ کاٹ کر پُل کے درمیان رکھ دیتا ہوں —— تم دونوں اس پر سے گزرو —— جس کے کپڑے جھاڑ میں اُلجھ گئے ، وہی جوتے کی مالک ہوگی !"

اس کے بعد ہسیو تسائی قریب ہی سے ایک جھاڑ کاٹ کر لایا اور اس نے وہ جھاڑ پُل کے درمیان رکھ کر ان سے کہا ۔

"لو ، اب تم دونوں اس پر سے گزرو —— ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے "

ڈیلین پہلے آگے بڑھی اور جھاڑ پر سے گزرتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اپنے کپڑے اس سے بھڑائے تاکہ وہ اس میں پھنس جائیں مگر ایسا نہیں ہوا ۔ اس کی کوشش کے باوجود اس کے کپڑے جھاڑ میں نہ اُلجھ سکے —— اب ڈیکا کی باری تھی ۔ جوں ہی ڈیکا آگے بڑھی اور جھاڑ پر سے گزرنے لگی ایکا ایکی تیز ہوا چلنے لگی ۔ ہوا سے اس کے کپڑے ادھر ادھر ہلے اور ہلنے کے ساتھ ہی جھاڑ میں اُلجھ گئے ۔ جب ہسیو تسائی نے یہ دیکھا تو بولا ۔

"یقیناً جوتا اسی لڑکی کا ہے ۔"

اس نے جوتا ڈیکا کو دے دیا —— اس کی سوتیلی ماں اور ڈیلین غصے میں تلملا رہی تھیں مگر وہ خوش تھی —— اور پھر چند ہی روز بعد ڈیکا زیوروں سے لدی پھندی پالکی میں بیٹھی ہسیو تسائی کے گھر جا رہی تھی —— اب وہ اس کی بیوی بن چکی تھی —— سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اس سے بہت دُور تھے اور اس کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ

بھر گئے تھے

ڈیکا اور مسیو تسائی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد اللہ نے انھیں ایک خوب صورت سا بیٹا دیا جس نے ان کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔ اب وہ تھے اور ان کا پیارا سا بیٹا تھا۔ ان کی اپنی ایک دنیا بن گئی تھی اور وہ مستقبل کے سنہرے خواب دیکھ رہے تھے ــــ مگر دن بیتتے دیر نہیں لگتی۔ وقت بدلنے لگے تو پلک جھپکتے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے یوں ہی ڈیکا کو خیال آیا۔

"کیوں نہ اپنی ماں سے مل آؤں ــــ سوتیلی ہے تو کیا ہوا ــــ؟"

اس نے اپنے بچے کو ساتھ لیا اور پالکی میں بیٹھ کر اپنی سوتیلی ماں کے گھر جا پہنچی۔ اس کی سوتیلی ماں کو یہ توقع بھی نہ ہو سکتی تھی کہ کبھی ڈیکا اس کے پاس آئے گی کیونکہ وہ اپنے ان مظالم سے اچھی طرح واقف تھی جو اس نے اس پر ڈھائے تھے۔ جب ڈیکا کی پالکی اس کے دروازے پر پہنچی تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ تاہم اسے دیکھا تو ظاہری محبت جتاتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے اس کا استقبال اس طرح کیا جیسے واقعی اس کے دل میں ڈیکا کے لیے بڑی چاہ ہو۔

"میری پیاری بیٹی ــــ کتنا عرصہ گزر گیا تمھیں دیکھے ہوئے!"

پھر وہ جھوٹ موٹ کا پیار ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"تمھیں دیکھ کر تو میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے ــــ آؤ بیٹی اندر آؤ ــــ تم تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو ــــ ذرا تھوڑی دیر کو آرام کر لو!"

پھر وہ بچے کو اپنی گود میں لے کر اسے پیار کرنے لگی۔

"آہا ــــ میرا نواسہ کتنا پیارا ہے ــــ کتنا اچھا ہے۔"

اس نے ڈیکا کی بڑی آؤ بھگت کی اور اس کے لیے طرح طرح کے نفیس کھانے تیار کرنے لگی۔ وہ اپنے برتاؤ سے یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے ڈیکا کو دیکھ کر انتہائی خوش ہے اور اس کے دل میں اس کے لیے بے پناہ محبت ہے ــــ دوسری طرف دلہن بھی

یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ اس کی ماں ڈیکا پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہو رہی ہے تو وہ حسد میں جل بھن گئی۔ اسے اپنی ماں پر غصہ آرہا تھا مگر بے بس تھی۔ جب اس سے یہ داشت نہ ہو سکا تو وہ مکان کے پچھواڑے جاکر رونے لگی۔

یوں تو اس کی ماں کو پہلے ہی سے اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ تھا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ ڈیلین روتی ہوئی مکان کے پچھواڑے چلی گئی ہے تو وہ اس کے پاس آئی اور چپکے سے کان میں کہا۔

"پاگل لڑکی! روتی کیوں ہو ——؟"

پھر وہ دھیمی آواز میں اسے سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ تمھاری ماں بے وقوف ہے ——؟!"

اتنا کہنے کے بعد اس نے آہستہ سے ڈیلین کے کان میں کچھ کہا اور اس کے ساتھ ہی ڈیلین نے رونا بند کر دیا۔ اس نے آنسو پونچھے اور خوشی خوشی گھر میں آگئی۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں —— تھوڑی دیر بعد ڈیلین ڈیکا سے کہنے لگی۔

"بہن ڈیکا —— !تم بہت عرصے کے بعد گھر آئی ہو —— تمھارے بعد یہاں بہت سی تبدیلیاں ہو گئی ہیں —— ہمارے پچھواڑے میں جو کنواں ہے، اس کا پانی اس قدر صاف و شفاف ہو گیا ہے کہ اوپر سے جھانکیں تو اس میں اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اسے کلائی سے پکڑتے ہوئے بولی۔

"آؤ چلو —— تمھیں دکھاؤں —— اس میں اپنا اپنا عکس دیکھتے ہیں ——؟"

ڈیکا نے انکار کرنا مناسب خیال نہ کیا اور کہا۔

"اچھا چلو —— دیکھتے ہیں!"

ڈیلین، ڈیکا کو ساتھ لے کر اپنے مکان کے پچھواڑے والے کنوئیں پر گئی اور اس سے کہا۔

"اب تم کنوئیں میں جھانک کر اپنا عکس دیکھو — کتنا اچھا لگتا ہے —؟"

اور پھر — جوں ہی ڈیکانے کنوئیں میں جھانکنے کے لیے سر آگے کی طرف جھکایا، اس نے بجلی کی سی تیزی سے بڑھ کر اسے دھکا دے دیا اور ڈیکا کنوئیں میں جا گری — اسے کنوئیں میں گرانے کے بعد ڈلین بھاگی بھاگی گھر میں آئی اور اپنی ماں سے کچھ کہنے کے بعد کمرے میں چلی گئی — اس نے جلدی جلدی بالکل ڈیکا جیسے کپڑے پہن لیے۔ اور پھر اس کے بچے کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"آؤ بیٹا! اب اپنے گھر چلیں —؟"

بچہ گو ابھی چھوٹا ہی تھا مگر وہ اسے دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ میری ماں نہیں ہے اس نے کہا۔

"نہیں، میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم میری امّی نہیں ہو!"

پھر اس نے ڈلین کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میری امّی کے چہرے پر چیچک کے داغ نہیں ہیں!"

ڈلین بچے کو پچکارتے ہوئے بولی۔

"بیٹے! کیا تم اپنی امّی کو بھی نہیں پہچانتے —؟ میں ہی تو تمھاری امّی ہوں —؟"

اتنا کہہ کر اس نے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی ابھی تمھاری نانی میرے لیے کھانا پکا رہی تھی کہ آگ زیادہ تیز ہو گئی جس کی وجہ سے تیل اُچھل کر میرے چہرے پر آگرا — اسی سے میرے چہرے پر داغ پڑ گئے ہیں —!"

پھر اس نے بچے کے گالوں پر تھپکی دیتے ہوئے پیار سے کہا۔

"بے وقوف! اب تم مجھے اپنی ماں ہی نہیں سمجھ رہے —؟"

بچہ بڑا حیران تھا — اس نے خیال کیا شاید یہی بات ہو گی — تیل گرنے کی وجہ سے میری امّی کے چہرے پر داغ پڑ گئے ہیں چنانچہ وہ ڈلین کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ ڈلین نے اسے ساتھ لیا اور مہیموتسائی کے گھر روانہ ہو گئی۔

جب ڈیلین بچے کو لے کر پالکی میں بیٹھی اور کہار پالکی اُٹھا کر جا رہے تھے تو انھوں نے محسوس کیا کہ پالکی کچھ ضرورت سے زیادہ بھاری ہے۔ آتے وقت تو یہ اتنی بھاری نہیں تھی۔۔

"بڑا تعجب ہے ——؟!"

کہاروں نے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"عورت اور بچے کا بوجھ کچھ زیادہ ہی لگ رہا ہے، حالانکہ آتے وقت تو پالکی اتنی بوجھل نہیں تھی ——؟"

ڈیلین نے بھی ان کی بات سُن لی تھی۔ اس کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں کہاروں کو اصل بات کا پتہ نہ چل جائے لہٰذا وہ پالکی میں بیٹھی ہی کہنے لگی۔

"یہ ایک عام کہاوت ہے کہ اگر کوئی شخص چاول کھائے تو اس کا پیٹ بڑھ جاتا ہے اور اگر کوئی پُڈنگ کھائے تو اس کا وزن زیادہ ہو جاتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی اور پھر کہاروں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"شاید تمھیں معلوم نہیں کہ میں نے ابھی ابھی پُڈنگ کھائی ہے اس لیے تمھیں میرا وزن زیادہ محسوس ہو رہا ہے۔"

کہاروں نے دل میں سوچا، ایسا ہی ہوگا ——! اور وہ پالکی اُٹھائے چلتے رہے۔

جب ڈیلین بچے کو لے کر مسیو تسانی کے گھر پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ وہ تو ڈیکا کے انتظار میں تھا اور یہاں سارا معاملہ اُلٹ نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو میری بیوی نہیں ہے!"

"اس کے چہرے پہ تو داغ نہیں تھے!"

"یہ ڈیکا تو نہیں لگتی!"

وہ تعجب سے اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا مگر ڈیلین نے اسے بھی یہی بتایا کہ جب وہ پُڈنگ بنا رہی تھی تو آگ تیز ہو گئی اور گرم گرم تیل اس پہ آ گرا

جس سے چہرے پہ داغ پڑ گئے ہیں ـــ اتنا کہنے کے ساتھ ہی وہ بچے کو پیار کرنے لگی اور بولی "عجیب بات ہے ـــ تم اپنی ڈیکا کو نہیں پہچانتے ـــ ؟"

ہسیو تسائی یہ سن کر چپکا تو ہو گیا مگر اس کا شک پوری طرح دور نہ ہو سکا ـــ وہ سوچ رہا تھا کہ گرم گرم تیل گرنے سے چہرہ اس قدر کیسے بدل سکتا ہے ـــ ؟ پھر وہ سوچنے لگا، ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہوا ہو ـــ ! یہی کچھ سوچ کر اس نے اسے اپنی بیوی مان لیا اور ڈیلین مزے میں زندگی گزارنے لگی۔

دن گزرتے گئے ـــ ایک روز ہسیو تسائی اس اسکول سے واپس گھر آ رہا تھا جہاں وہ بچوں کو پڑھاتا تھا۔ راستے میں ایک درخت پر ایک چھوٹی سی کوئل بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ اس درخت کے قریب سے گزرا تو کوئل اپنی سریلی آواز میں گانے لگی۔

"کوکو ـــ کوکو !

ایک خوب صورت بیوی، داغوں والے چہرے والی بد شکل عورت میں بدل گئی۔"

کوئل کے منہ سے یہ الفاظ سن کر ہسیو تسائی بڑا حیران تھا۔ اسے تعجب تھا کہ ایک کوئل کو یہ بات کیسے معلوم ہو گئی ـــ ؟ اس نے اپنے دل میں خیال کیا، شاید یہ میری بیوی ڈیکا کی روح ہے۔ یہی سوچ کر اس نے کوئل کو جواب دیا۔

"کوکو ـــ کوکو !

اگر واقعی تم میری بیوی ہو تو نیچے آ جاؤ ـــ اور میری آستین میں آ کر چھپ جاؤ ـــ ؟"

اتنا کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے کرتے کی آستین کھول دی اور دیکھتے ہی دیکھتے کوئل نیچے آ کر اس کی آستین میں چھپ گئی۔ ہسیو تسائی کوئل کو اپنے ساتھ گھر لے آیا اور اسے ایک پنجرے میں بند کر کے دیوان خانے میں لٹکا دیا۔ وہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتا تھا ـــ جب بھی گھر میں ہوتا زیادہ وقت اسی کے پاس

گاتا اور طرح طرح سے اس کا دل بہلاتا رہتا۔

ایک روز ڈیلین گھر میں اکیلی تھی۔ کوئی کام کاج بھی نہیں تھا جس میں مصروف ہو جاتی۔ یوں ہی گھر میں ادھر سے ادھر گھوم رہی تھی کہ غیر ارادی طور پہ دیوان خانے میں چلی آئی ۔۔ وہاں ایک ہاتھ کی کھڈی لگی ہوئی تھی۔ کھڈی کو دیکھ کر اس نے سوچا۔

"آج میں بھی کپڑا بُن کر دیکھوں کہ کیسے بُنا جاتا ہے ۔۔؟"

وہ کھڈی کے پاس بیٹھ گئی اور کپڑا بُننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے زندگی میں کبھی کھڈی نہیں چلائی تھی جو اسے کپڑا بُننا آتا ہوتا تاہم وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ کپڑا کیسے بُنا جاتا ہے ۔۔ جوں ہی اس نے نلکی ڈال کر کھڈی چلانا شروع کی، اس کے ساتھ ہی ایک طرف پنجرے میں لٹکی ہوئی کوئل گانے لگی۔

"کوکو ۔۔ کوکو!

تم نے ایک بیوی کو قتل کیا ہے اور ایک شوہر کو دھوکا دیا ہے

تم نے اسے حسد کی وجہ سے قتل کیا ہے

کھڈی کی آوازوں کی طرح تمھارے دل میں غصّہ بھرا ہوا ہے۔"

ڈیلین یہ سُن کر غصّے میں بھنا گئی۔ اس نے ایک چھڑی پکڑی اور آگے بڑھ کر پنجرے کو نیچے گرا دیا ۔۔ جوں ہی کوئل کا پنجرہ نیچے گرا وہ پھر گانے لگی۔

"کوکو ۔۔ کوکو!

ڈیلین نو دُموں والی لومڑی ہے

وہ شیر کی طرح ظالم ہے

وہ سانپ کی مانند زہریلی ہے۔"

اب تو ڈیلین آپے سے باہر ہو گئی۔ وہ غصّے میں پاگلوں کی طرح آگے بڑھی، پنجرہ کھول کر کوئل کو باہر نکالا اور گلا مروڑ کر اسے ختم کر دیا ۔۔ اس شام جب میو تسائی گھر آیا تو دیوان خانے میں کوئل نہیں تھی۔ وہ بڑا پریشان ہوا۔ اس نے گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر کوئل کا پنجرہ کہیں دکھائی نہ دیا ۔۔ اس نے ڈیلین سے پوچھا۔

"آج میری کوئل کہاں ہے —؟"

جواب میں ڈیلین نے اسے بتایا۔

"میں نے اسے جان سے مار دیا ہے۔"

یہ سن کر ہیسو تسائی سٹ پٹا گیا۔ اس نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"تم نے اسے کیوں مارا ہے —؟"

آگے سے ڈیلین بڑے اطمینان سے بولی۔

"میں نے شوربہ بنانے کے لیے اسے مارا ہے!"

اتنی بات کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر باورچی خانے میں گئی اور دو پیالے لے آئی جن میں شوربہ بھرا ہوا تھا۔ ایک پیالہ اس نے ہیسو تسائی کو دیا اور دوسرا اپنے آگے رکھ لیا۔ پھر وہ کہنے لگی۔

"آج میں نے بڑی محنت اور شوق سے شوربہ تیار کیا ہے۔"

جوں ہی ڈیلین نے شوربے کو منہ لگایا اسے کپکپی سی آگئی — شوربہ اس قدر کڑوا تھا کہ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے نس نس میں کڑواہٹ پھیل گئی ہو۔ اس کے برعکس ہیسو تسائی کا شوربہ انتہائی خوش ذائقہ تھا اور وہ بڑے مزے سے چسکیاں لے لے کر پی رہا تھا۔ ڈیلین نے یہ دیکھا تو کہنے لگی۔

"لاؤ — ہم اپنے پیالے تبدیل کر لیں —؟"

مگر پیالے تبدیل کرنے کے باوجود ڈیلین کا شوربہ کڑوا تھا اور ہیسو تسائی کا خوش ذائقہ — ڈیلین نے اپنا کڑوا شوربہ ہیسو تسائی کو دے کر خود اس کا پیالہ لے لیا تھا مگر اس کا کڑوا شوربہ جیسے ہی ہیسو تسائی نے پیا خوش ذائقہ ہو گیا اور ہیسو تسائی کا شوربہ ڈیلین نے پیا تو وہ کڑوا ہو گیا — اس سے ڈیلین اور بھی غصے میں آگئی۔ اس نے اپنا شوربے سے بھرا ہوا پیالہ اٹھایا اور اسے صحن میں پھینک دیا — اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ جہاں ڈیلین نے اپنا شوربہ پھینکا تھا، کچھ دنوں بعد وہاں

بانس کا ایک پودا اُگ آیا — یہ پودا دیکھتے ہی دیکھتے بڑا ہو گیا، اس میں کئی بانس اُگ آئے اور پھر باقاعدہ درخت بن گیا — بانس کے اس درخت کی چھاؤں خاصی گھنی تھی۔ اس لیے ہسیو تسائی اکثر آرام کرنے کے لیے اس کے نیچے بیٹھ جاتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں زمین بہت ٹھنڈی ہوتی تھی اور جب ہسیو تسائی وہاں بیٹھتا تھا تو اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ اسی طرح ایک روز وہ بانس کے درخت کے نیچے بیٹھا آرام کر رہا تھا کہ ایکا ایکی بھورے رنگ کا ایک پھل اس کی گود میں آگرا — اس نے اسے چکھا تو وہ انتہائی میٹھا اور لذیذ تھا۔ ہسیو تسائی نے بڑے مزے سے وہ کھا لیا — جب ڈیلین کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ کچھ حیران بھی ہوئی اور اسے غصہ بھی آیا۔ اس نے سوچا۔ بھلا بانس کو کون سا پھل لگتا ہے —؟ وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگی کہ اس قسم کے سب واقعات ہسیو تسائی کے ساتھ ہی پیش کیوں آتے ہیں —؟ وہ کچھ دیر اسی قسم کی باتیں سوچتی رہی اور پھر جلدی سے جا کر بانس کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئی — وہ کتنی دیر تک بیٹھی انتظار کرتی رہی مگر کوئی پھل اس کی گود میں نہ گرا بلکہ اُلٹا یہ ہوا کہ بانس کی چند ٹہنیاں نیچے جُھک کر زور زور سے اس کے سر پہ لگیں اور بالوں میں اُلجھ گئیں — بالوں میں اُلجھ کر ٹہنیوں نے اسے زور زور سے جھنجھوڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈیلین کے بہت سے بال ٹوٹ کر زمین پہ جا گرے — ڈیلین نے درد کے مارے چیخنا چلانا شروع کر دیا — اس کی چیخ پکار سُن کر ہسیو تسائی بھاگا بھاگا صحن میں آیا — اس نے دیکھا، ڈیلین کی حالت مضحکہ خیز بنی ہوئی تھی۔ ڈیلین نے اسے بتایا کہ اس طرح بانس کی ٹہنیاں اس کے سر پہ زور زور سے ٹکرائیں اور پھر انھوں نے بالوں میں اُلجھ کر بال نوچ ڈالے ہیں۔ ہسیو تسائی نے ایک چاقو لیا اور جو ٹہنیاں ڈیلین کے بالوں سے الجھی ہوئی تھیں انھیں کاٹ دیا — ٹہنیوں کا کاٹنا تھا کہ ڈیلین زمین پہ گر پڑی اور اس کے سارے جسم میں شدید درد ہونے لگا — اب تو وہ اور بھی غصّے میں بپھر گئی — وہ جلدی سے اُٹھی، آگے بڑھ کر ہسیو تسائی کے ہاتھ سے چاقو چھینا اور بانس کا سارا درخت کاٹ ڈالا — ادھر جب ان کے پاس پڑوس والوں کو پتہ چلا کہ انھوں نے بانس کا سارا درخت کاٹ ڈالا ہے تو کئی لوگ

دیکھنے کے لیے وہاں آکر جمع ہو گئے ۔۔۔ ان لوگوں میں ایک بوڑھی عورت بھی تھی ۔ اس بوڑھی عورت نے ہیسوتسائی سے درخواست کی ۔

"بیٹا! ایک بانس مجھے دے دو تاکہ میں اپنی کھڈی کے لیے نلکیاں بنالوں ۔"

ہیسوتسائی نے ایک بانس اس بڑھیا کو دے دیا اور بڑھیا بانس لے کر اپنے گھر آگئی ۔۔۔ اس نے اس بانس سے اپنی کھڈی کے لیے نلکیاں بنائیں اور ایک نلکی کھڈی میں لگادی ۔۔۔ اس نئی نلکی کا کھڈی میں لگانا تھا کہ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا ۔ بڑھیا بےچاری دن بھر کھیتوں میں کام کرتی تھی اور شام کو گھر آکر تھوڑا بہت کپڑا بنتی تھی مگر اس روز جب وہ کھیتوں سے واپس آئی تو یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی کہ وہاں کھڈی پر بہت سا بنا ہوا کپڑا پڑا تھا ۔۔۔ وہ تو دن بھر کھیتوں میں کام کرتے کرتے ہی تھک جاتی تھی ۔۔۔ شام کو گھر آکر اسے ہنڈیا روٹی بھی کرنا ہوتی تھی اور پھر تھوڑا سا وقت نکال کر کپڑا بنتی تھی لیکن اب جو اس نے اتنا سارا بنا ہوا کپڑا دیکھا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ۔۔۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ۔۔۔؟ کپڑا کون بن گیا ۔۔۔؟ پھر یہ کپڑا بھی اتنا تھا کہ ایک ساتھ دس کھڈیاں دن بھر چلتی رہیں تو تب کہیں جا کر اتنا سارا کپڑا تیار ہو سکتا تھا ۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا ۔

"ہو سکتا ہے ۔۔۔ یہ کپڑا کوئی پڑوسی چھوڑ گیا ہو ۔۔۔؟!"

اس خیال سے اس نے اپنے پاس پڑوس کے تمام لوگوں سے دریافت کیا لیکن سب نے جواب دیا ۔

"یہ کپڑا ان کا نہیں ہے !"

البتہ ان میں سے بعض نے بڑھیا کو یہ بتایا کہ ۔

"سارا دن تمھارے گھر میں کوئی کپڑا بنتا رہا ہے ۔۔۔ کھڈی چلنے کی آواز ہم نے خود سنی ہے ۔"

بڑھیا یہ سن سن کر بہت حیران تھی ۔۔۔ بھلا ایسا کون شخص ہو سکتا ہے جو اس کے ہاں سارا دن کپڑا بنتا رہا ہو اور ایک ہی دن میں اس قدر زیادہ کپڑا بن گیا ہو ۔۔۔؟

اسی حیرانی میں اس نے رات کاٹ دی اور دوسرے روز وہ اپنے کھیتوں میں نہیں گئی ۔ اس نے سوچا۔ آج میں خود دیکھوں گی کہ کپڑا کون بُنتا ہے ۔۔۔؟ وہ گھر میں ایک ایسی جگہ چھپ کے بیٹھ گئی جہاں اسے کوئی دوسرا نہ دیکھ سکے مگر وہ سب کچھ دیکھ سکے ۔

ابھی بڑھیا کو چھپے ہوئے کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اچانک اس نے ایک انہونا سا منظر دیکھا ۔ اس نے کھڈی میں جو بانس کی نئی نلکی ڈالی تھی ، اس میں سے ایک انتہائی خوب صورت اور جوان لڑکی برآمد ہوئی ۔ اس نے پہلے کمرے میں چاروں طرف غور سے جائزہ لیا اور جب جان گئی کہ وہاں کوئی موجود نہیں ہے تو کھڈی پہ بیٹھ کر کپڑا بُننے لگی ۔

قریب ہی چھپی ہوئی بڑھیا یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی ۔ وہ اس عجیب و غریب واقعے سے اس قدر حیران تھی کہ اس پہ سکتہ سا طاری تھا ۔۔۔ اس نے زندگی بھر میں ایسا واقعہ نہ دیکھا اور نہ سُنا تھا ۔۔۔ وہ دل میں سوچنے لگی ۔

"کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ۔۔۔ ؟"

لیکن نہیں ۔۔۔ وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھی ۔۔۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی عالم میں حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات میں بیٹھی اسے کپڑا بُنتے دیکھتی رہی اور پھر لپک کر اس نے لڑکی کی کلائی پکڑ لی ۔

"اے لڑکی ! تم بہت خوب صورت ہو !"

پھر وہ بڑے پیار سے بولی ۔

"بتاؤ ، تمھارا نام کیا ہے ۔۔۔؟ تم کہاں رہتی ہو ۔۔۔؟"

لڑکی نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر بڑھیا نے اسے بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا ۔ جب وہ مجبور ہوگئی تو اس نے بڑے میٹھے اور دھیمے لہجے میں جواب دیا ۔

"مہربان عورت ! میرا کوئی گھر نہیں ہے اور نہ ہی میری کوئی ماں ہے !"

اس پہ بڑھیا اور بھی خوش ہوئی اور بولی ۔

"اگر ایسا ہے تو تم میری بیٹی بن جاؤ ۔۔۔ آج سے میں تمھاری ماں ہوں ۔۔۔ ؟"

"بہت اچھا ۔۔۔ آج سے تم مجھے اپنی بیٹی سمجھو !"

لڑکی بھی خوش ہو گئی ــــ اس نے بڑھیا سے کہا ۔

" مگر میں تو صرف ایک روح ہی روح ہوں ــ مجھے ایک عورت نے قتل کر دیا تھا اور اب میرے جسم میں نہ ہڈیاں ہیں اور نہ گوشت ہے ۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے بڑھیا کو سمجھاتے ہوئے کہا ۔

" پیاری اماں ــــ ! تم اسی وقت بازار جاؤ اور چند نئی چوب اسٹک (وہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جن سے چینی لوگ چاول کھاتے ہیں) خرید کر لاؤ ــ انھیں کسی برتن میں ڈال کر اُبالو اور جب پانی میں انھیں اُبالو، وہ مجھے پلا دو ــــ یہ پانی پینے سے میں پھر انسانی روپ میں آ جاؤں گی ــــ ؟"

بڑھیا نے ویسا ہی کیا جیسا اسے لڑکی نے کہا تھا ۔ وہ اسی وقت بھاگی بھاگی بازار گئی اور چند نئی چوب اسٹک خرید لائی ۔ پھر اس نے انھیں اُبالا اور جب پانی میں اُبالا، وہ لڑکی کو پلا دیا ــــ جوں ہی لڑکی نے پانی پیا وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت اور جوان ہو گئی ــ اس کے جسم میں ہڈیاں بھی ہو گئیں اور گوشت بھی آ گیا ــ اور اب ایک بار پھر وہ زندہ تھی ۔

کئی روز گزر گئے ــ بڑھیا خوش تھی کہ اب وہ اکیلی نہیں ہے ۔ اس کے کام میں ہاتھ بٹانے والا بھی ہے ــ لڑکی ہر طرح سے اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی اور وہ بھی اسے بیٹی کی مانند چاہتی تھی ــ ایک روز وہ دونوں بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں کہ لڑکی نے کہا ۔

" ماں ! آج موسم بہت خوش گوار ہے ــ میں چاہتی ہوں کہ آج ایک مہمان کی دعوت کر دوں ؟"

" وہ کون ہے جس کی تم دعوت کرنا چاہتی ہو ــ ؟"

بڑھیا نے دریافت کیا ــــ اس پہ لڑکی بولی ۔

" ہمارے گاؤں میں رہنے والا ہمیو تسائی ــــ میں اس کی دعوت کرنا چاہتی ہوں ــ ؟"

جواب میں بڑھیا قدرے مایوس لہجے میں کہنے لگی۔

"بیٹی! وہ اونچے خاندان کا آدمی ہے —— ہم غریبوں کی دعوت کیونکر قبول کرے گا؟"

لڑکی نے اسے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔

"ماں! کوئی بات نہیں —— تم اس کے پاس جاؤ تو سہی ——؟"

بڑھیا کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ہسیو تسائی ان کے گھر آجائے گا مگر جب لڑکی نے مجبور کیا تو اس نے کہا۔

"اچھا! جیسے تیری مرضی —— میں جاتی ہوں!"

اس پہ لڑکی نے اسے بتایا کہ۔

"اس کے پاس جاکر کہنا کہ میرے گھر میں ایک لڑکی ہے۔ وہ آج تمھاری دعوت کرنا چاہتی ہے —— اور جب تم آؤ تو اپنے بچے کو بھی ساتھ لیتے آنا!"

بڑھیا نے دیکھا کہ لڑکی اپنی ضد پہ اڑی ہوئی ہے تو وہ ہسیو تسائی کے پاس چلی گئی اس کا خیال تھا کہ وہ دعوت قبول نہیں کرے گا مگر ہسیو تسائی نے آگے سے کوئی عذر نہ کیا اور اپنے بچے کو ساتھ لے کر خوشی خوشی بڑھیا کے ساتھ اس کے گھر آگیا۔

گھر پہنچ کر بڑھیا نے انھیں عزت سے بٹھایا اور خود کھانا چننے میں لگ گئی —— لڑکی ہسیو تسائی کے سامنے نہیں آئی بلکہ قریب ہی ایک کھڑکی کے پردے کی اوٹ میں بیٹھ کر ان کی باتیں سننے لگی —— بڑھیا نے کھانا لگایا اور وہ تینوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ہسیو تسائی حیران تھا کہ جس لڑکی نے یہ دعوت کی ہے اور جس کا میں مہمان ہوں وہ سامنے کیوں نہیں آئی —— ؟ وہ بڑھیا سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ لڑکی کو بھی بلاؤ —— خاموشی سے انہی خیالات میں کھویا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ اتنے میں بڑھیا نے بچے کو مرغی کی ایک ٹانگ دی جسے وہ بڑے مزے سے کھانے لگا لیکن عین اس وقت ایک کالے اور سفید رنگ کی بلی آئی۔ وہ بچے کی طرف لپکی اور اس کے ہاتھ سے مرغی کی ٹانگ اچک کر اس کھڑکی میں کود گئی جس کے پیچھے لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے نے بلی کا پیچھا کیا اور جیسے ہی اس نے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر جھانکا وہ چیخ پڑا۔

"امّی ــــ میری امّی ــــ یہی میری امّی ہے!"

اسیو تسائی اپنے بچے کے منہ سے امّی کا لفظ سُن کر چونک پڑا۔ اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رُک گیا۔ اس نے تعجب سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اُٹھ کر جلدی سے اس کھڑکی کی طرف گیا جہاں سے بلّی کودی تھی اور اس کا پیچھا کرتے ہوئے بچہ بھی دوسری جانب چلا گیا تھا ــ جوں ہی وہ کھڑکی کے قریب آیا، اس نے پردہ اُٹھا کر دیکھا اور ایک لمحہ کے لیے جیسے وہ پتھر بن گیا ــ اس کے سامنے ایک حسین لڑکی اس کے بچے کو سینے سے لگائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے آنسو رخساروں پہ ڈھلک رہے تھے اور بچہ اس سے لپٹا ہوا خوشی سے مسکرا رہا تھا

"ڈیکا ــــ! میری ڈیکا ــ!!"

وہ بھی بچوں کی طرح پکارتا ہوا اس طرف لپکا اور جا کر ڈیکا سے لپٹ گیا۔ وہ خوشی میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا ــ بار بار ڈیکا کو سینے سے لگاتا اور اس کے بوسے لیتا ــ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے رو رہے تھے مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔

دوسرے روز اسیو تسائی بڑھیا کے گھر گیا اور اس سے ڈیکا کو واپس لانے کی اجازت چاہی۔ بڑھیا نے خوشی خوشی اسے اجازت دے دی اور وہ اس کا شکریہ ادا کر کے ڈیکا کو اپنے ساتھ لے کر گھر آ گیا ــ اِدھر جوں ہی ڈلین نے ڈیکا کو اپنے سامنے دیکھا تو وہ بہت حیران ہوئی ــ وہ خوف زدہ بھی تھی کہ اب اس کے ظلم کا سارا راز کھل جائے گا ــ اس نے تعجب اور پریشانی میں ڈیکا سے پوچھا۔

"تم تو کنوئیں میں ڈوب گئی تھیں ــــ تعجب ہے تم اب تک زندہ ہو ــ؟ تم اس کنوئیں سے زندہ سلامت کیسے باہر آ گئیں ــ؟"

جواب میں ڈیکا مسکراتے ہوئے بولی۔

"شاید تمھیں نہیں معلوم کہ کسی کو جان سے مارنا آسان نہیں ہوتا!"

پھر اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"جس انسان کا دل مہربان اور ہمدرد ہو اسے تم کبھی قتل نہیں کر سکتیں!"

ڈیکا کے گھر آجانے سے ڈیلن بہت پریشان تھی ـــــ اسے کچھ نہیں سوجھتا تھا ـــ وہ دل ہی دل میں حسد سے جل رہی تھی ـــــ ایک روز اس نے باتوں باتوں میں ڈیکا سے پوچھا۔

"تمھاری جلد اس قدر خوب صورت اور سفید کیوں ہے ـــ؟"

ڈیکا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"میری ماں نے مجھے اوکھلی میں ڈال کر اوپر سے موسل سے خوب کوٹا تھا ـــــ یہی وجہ ہے کہ میری جلد کا رنگ سفید اور خوب صورت ہو گیا!"

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو ـــــ؟ مجھے تو یقین نہیں آتا ـــ؟"

ڈیلن نے شک اور تعجب کے ملے جلے لہجے میں کہا ـــ اس پر ڈیکا بولی۔

"اس میں شک کی کیا بات ہے ـــــ؟ جب چاول اوکھلی میں ڈال کر موسل سے کوٹے جائیں تو وہ سفید ہو جاتے ہیں تو پھر ایک لڑکی کیوں سفید نہیں ہو سکتی ـــ؟"

"ہاں ـــــ تم ٹھیک کہہ رہی ہو!"

ڈیلن اس کی دلیل مان گئی تھی۔ اس نے کہا۔

"میں کل ہی اپنی ماں کے پاس جاؤں گی اور اسے کہوں گی کہ وہ میری جلد بھی سفید کر دے!"

چنانچہ دوسرے روز وہ بھاگی بھاگی اپنی ماں کے پاس جا پہنچی اور اسے ساری بات سنائی، جو ڈیکا نے اسے بتائی تھی۔ پھر وہ ایک بڑی سی اوکھلی میں کود گئی اور اپنی ماں سے کہنے لگی۔

"لو ماں ـــــ! اب تم اوپر سے مجھ پر موسل مارو ـــ!"

اس کی ماں بھی حسد میں اندھی ہو گئی تھی ـــ اس نے بھی یہی خیال کیا، اس طرح میری بیٹی بھی ڈیکا کی طرح حسین ہو جائے گی۔ اس نے نہ کچھ سوچا نہ سمجھا، نہ جانا نہ بوجھا اور اوکھلی میں بیٹھی ڈیلن پر موسل برسانا شروع کر دیئے ـــــ ابھی

دو چار موسل ہی پڑے تھے کہ ڈیلین نے وہیں دم توڑ دیا — اس کی ماں بڑی پچھتائی مگر اب کیا کر سکتی تھی — ؟ اس نے خود ہی تو سب کچھ کیا تھا۔ اسی کے غم میں چند روز زندہ رہ کر وہ بھی ڈیلین سے جا ملی۔

اس کے بعد ہسیو تسائی اور ڈیکا اپنے چاند سے خوب صورت بیٹے کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی کے دن گزارتے رہے۔

کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ڈیلین اور اس کی ماں کی روحیں دو پرندوں میں تبدیل ہو گئی تھیں — یہ پرندے چیو اور چیاؤ ہیں جو آج بھی دن رات گاتے رہتے ہیں کہ — "دوسروں کو نقصان پہنچانا دراصل اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے!"

وفادار بیوی

SEEKING HER HUSBAND
AT THE GREAT WALL



یہ آج سے دو سو سال سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں چن خاندان کے پہلے بادشاہ نے تخت و تاج سنبھالا تھا۔ اس کا نام شی ہاؤنگ تھا اور اس کی حکومت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بادشاہ اپنے عمل و کردار کے لحاظ سے بڑا ظالم تھا اور طرح طرح سے اپنی رعایا پہ ظلم ڈھاتا تھا۔ اس کے ظلم و ستم کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص اس سے محفوظ نہ تھا — اس نے اپنی اور اپنی سلطنت کی حفاظت کے لیے عظیم دیوار تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا اور حکم دیا کہ یہ دیوار جلد سے جلد تعمیر کی جائے — ملک کے کونے کونے سے لوگوں کو زبردستی لایا جانے لگا تاکہ وہ بیگار میں کام کریں اور عظیم دیوار کی تعمیر میں حصّہ لیں۔ کسی کی مجال نہ تھی جو بیگار میں جانے سے انکار کرے۔ اگر کوئی انکار کرتا تو اسے مار مار کر زبردستی لے جایا جاتا۔ اس طرح ہزاروں لوگ اپنے گھروں سے جُدا ہو گئے — بیویوں سے شوہر الگ کر دیئے گئے — بہنوں سے بھائی بچھڑ گئے اور ماؤں سے ان کے بیٹے چھین لیے گئے — مُلک کے دُور دراز علاقوں سے بیگاری لائے جاتے اور ان سے دن رات کام لیا جاتا — یہ بیگاری بے چارے رُکے یا سستائے بغیر مسلسل بوجھ اُٹھاتے، اینٹیں اور پتّھر ڈھوتے اور عظیم دیوار کی تعمیر و تکمیل میں مصروف رہتے۔ اگر وہ بیگاری ذرا سُستی دکھاتے یا کچھ دیر کو آرام کرنے کے لیے رُک جاتے تو انھیں سزائیں دی جاتیں — بادشاہ کی طرف سے متعیّن کام کی نگرانی کرنے والے ان پہ بے دریغ کوڑے برساتے۔ ان

کے جسموں پہ کوڑوں کی بارش کر دی جاتی اور بے طرح گالیاں دی جاتیں ـــ اس مسلسل بیگار اور بے انتہا محنت کے عوض انھیں کیا دیا جاتا ـــ؟ بے وجہ کی سزائیں اور بہت تھوڑی خوراک ـــ نہ ہونے کے مطابق آرام اور دن رات جھڑکیاں ـــ جہاں تک کپڑوں لتّوں کا تعلق تھا، وہ اپنے تن کے پرانے کپڑوں ہی کو سی کر اور تھگلیاں لگا کر گزارا کرتے تھے ـــ ان میں سے بیشتر کے لباس جگہ جگہ سے پھٹے ہوتے تھے مگر وہ اس حالت میں بھی بیگار کرنے پر مجبور تھے ـــ اگر وہ مشقت نہ کرتے تو ان کے نگران انھیں مار مار کر لہو لہان کر دیتے ـــ اس مسلسل بیگار اور ظلم و ستم سے ہر روز کئی آدمی مر جاتے تھے اور جو بچ رہتے وہ مزید ظلم برداشت کرتے تھے۔

بیگار اور ظلم کے شکار ان بے شمار لوگوں میں وان سی لیانگ بھی شامل تھا۔ اسے بھی زبردستی اس بیگار کے لیے اپنے گھر سے جدا کر دیا گیا تھا اور وہ بھی ہزاروں دوسرے لوگوں کے ساتھ شی ہاؤنگ بادشاہ کی عظیم دیوار کی تعمیر میں لگا ہوا تھا ـــ وان سی لیانگ کی ایک بیوی تھی جو انتہائی نیک دل اور پاک باز ہونے کے ساتھ ساتھ بے انتہا حسین تھی ـــ اس کا نام مینگ چیانگ نو تھا۔ وہ بھی ان لاکھوں مظلوم عورتوں میں سے ایک تھی جن کے شوہروں کو زبردستی ان سے جدا کر دیا گیا تھا اور جو ان کے انتظار میں تڑپ رہی تھیں۔

مینگ چنگ نو کے شوہر کو گئے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا ـــ وہ جب سے گیا تھا اس وقت سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی۔

"وہ کہاں ہے ـــ؟"

"کس حال میں ہے ـــ؟"

مینگ چنگ نو کو اس کے بارے میں کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہر وقت غمگین رہتی تھی کہ اس کا شوہر یقیناً اس ملعون بادشاہ کے ظلم و ستم کا شکار ہو گا اور بیگار میں تکلیفیں اٹھا رہا ہو گا۔

"مگر وہ اس کے لیے کیا کر سکتی تھی ـــ؟"

انھیں خیالات میں مینگ چیانگ نو ہر وقت اداس رہتی تھی ۔۔ دن ہو یا رات تنہا ہو یا دوسرے لوگوں میں، وہ ہر آن اپنے شوہر ہی کے بارے میں سوچتی رہتی تھی ۔ ہر وقت اسی کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی تھی ۔۔ جوں جوں دن بیت رہے تھے اسے ظالم بادشاہ سے اور بھی نفرت ہوتی جارہی تھی جس نے اس کے شوہر کو اس سے جُدا کر دیا تھا۔

ایک موسم بہار میں جب کہ پھول پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور درختوں پر ہرے بھرے پتّے بہار دے رہے تھے ۔۔ گھاس پوری طرح سرسبز اور گھنی ہو چکی تھی ۔ ابابیلیں جوڑوں کی صورت میں آسمان پہ پرواز کرتی نظر آتی تھیں ۔ اس پُر بہار ماحول میں اس کا غم اور بھی زیادہ ہو گیا تھا ۔ وہ اور بھی زیادہ اداس ہو گئی تھی ۔۔ ہر طرف بہار کی رنگینیاں تھیں مگر اس کی زندگی میں خزاں کا دور دورہ تھا ۔۔ ایسے میں جب وہ گھر سے نکل کر کھیتوں میں جاتی تو اس کا دُکھ اور بڑھ جاتا ۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے چاروں جانب نگاہ ڈالتی اور درد بھرے لہجے میں گنگنانے لگتی ؎

" مارچ کے مہینے میں شفتالو کے درخت پھولوں کے لباس پہن لیتے ہیں ۔
ابابیلیں اپنے گھونسلے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہیں ۔
وہ جوڑوں کی صورت میں خوشی میں پرواز کرتی ہیں ۔
لیکن میں اکیلی ہوں ۔۔ آہ ! میں کس قدر اداس ہوں "

یہ بہار بھی گزر گئی اور اس کی جگہ خزاں نے لے لی ۔۔ مینگ چیانگ نو کو ابھی تک اس کے شوہر کے بارے میں کوئی خبر نہ مل سکی تھی ۔ وہ اسی طرح انتظار میں گھڑیاں گن رہی تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ اداس تھی ۔ اسی زمانے میں یہ خبر عام پھیل گئی کہ جنوب کی جانب جہاں عظیم دیوار تعمیر کی جارہی ہے، وہاں بے پناہ سردی پڑ رہی ہے ۔ اس قدر ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں کہ کوئی آدمی اپنا ہاتھ آستین سے باہر نہیں نکال سکتا ۔۔ پالے سے لوگ ٹھٹھر جاتے ہیں اور برف باری کی وجہ سے چلنا مشکل ہے ۔۔ جب یہ خبر مینگ چیانگ نو تک پہنچی تو وہ بہت گھبرائی ۔ اس نے اپنے دل میں سوچا ۔

" اتنی شدید سردی میں بیگار کرتے ہوئے اس کے شوہر کا نہ جانے کیا حال ہوگا ۔۔ "

یہ سوچتے ہی جیسے وہ خیالات میں کھو گئی ——— اسے کیا کرنا چاہیے ——— ؟

پھر اس نے فوری طور پہ اپنے شوہر کے لیے سوت کے تہہ دار موٹے کپڑے اور جوتے تیار کیے تا کہ وہ شدید سردی سے محفوظ رہ سکے مگر اب مسئلہ یہ تھا۔

"کپڑے اور جوتے اس کے شوہر تک کون پہنچائے ——— ؟"

جنوب کی سمت جہاں عظیم دیوار تعمیر ہو رہی تھی، وہ جگہ بہت دور تھی ——— وہاں جانا کوئی آسان کام نہ تھا ——— پھر یہ بھی تھا کہ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا، وہ دیوار کتنی دور اور کہاں تعمیر ہو رہی ہے ——— ؟ وہ اس مسئلے پر بار بار سوچتی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا ——— کئی روز تک اسی شش و پنج میں پڑی رہی ——— اور آخر اس نے فیصلہ کیا کہ۔

"یہ کام میں خود کروں گی خواہ سفر کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو ——— میں وان ہسی لیانگ کو خود کپڑے اور جوتے دے کر آؤں گی !"

اس نے سفر کے لیے ضروری تیاری کی اور گھر سے نکل کر جنوب کی طرف چل دی

جن دنوں مینگ چیانگ نو نے سفر شروع کیا، اس وقت سردی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ درختوں اور پودوں کے پتے جھڑ چکے تھے اور فصلیں کاٹ کر گھروں اور کھلیانوں میں جمع کی جا چکی تھیں۔ کھیت بالکل خالی، ویران اور اداس دکھائی دے رہے تھے۔ چاروں طرف ایک ہی منظر تھا، ایک ہی سی اداسی چھائی ہوئی تھی مینگ چیانگ نو کے لیے تنہا یہ طویل سفر طے کرنا بڑا مشکل تھا ——— خاص طور پہ اس صورت میں جب کہ وہ آج تک کبھی اس طرح اپنے گھر سے باہر نہ نکلی تھی ——— نہ اسے راستے معلوم تھے اور نہ وہ یہ جانتی تھی کہ اسے کس سمت کو جانا ہے لیکن پھر بھی وہ لوگوں سے پوچھتی پاچھتی جنوب کی طرف چلتی رہی ——— وہ دن بھر چلتی رہتی اور رات کسی گاؤں یا شہر میں بسر کر لیتی ——— اس طرح رات بھر آرام کرنے کے بعد صبح پھر اس کا سفر جاری ہو جاتا۔

ایک روز وہ حسب معمول اپنے سفر پہ جا رہی تھی ——— اس کا خیال تھا کہ وہ

شام ہوتے ہوتے کسی گاؤں یا شہر میں پہنچ جائے گی۔ رات وہاں بسر کرے گی اور دوسری صبح پھر اپنے سفر پہ چل دے گی مگر شام ہو گئی تھی وہ ابھی تک کسی بستی میں نہ پہنچ سکی تھی —— اس نے بہتیرا تیز تیز آگے بڑھنے کی کوشش کی تاکہ کسی آبادی تک پہنچ جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ دوسری طرف دن ختم ہو چکا تھا اور شام کے سائے گہرے سے گہرے ہوتے جا رہے تھے —— اندھیرا چاروں جانب سیلاب کی مانند پھیلتا جا رہا تھا اور اب سفر جاری رکھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس نے بے بسی کے عالم میں ارد گرد نظریں دوڑائیں تاکہ رات بسر کرنے کے لیے کوئی ٹھکانہ دکھ جائے —— اتنے میں اسے راستے کی ایک جانب درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹی سی عمارت دکھائی دی۔ اس نے دل میں سوچا۔

"چلو —— یہیں رات بسر کر لیتی ہوں!"

اور یہ سوچ کر وہ اس عمارت کی طرف چل دی —— جب وہ اس عمارت کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا، وہ ایک عبادت گاہ تھی —— اس سے اس کے دل کو اور بھی اطمینان ہوا —— وہ عبادت گاہ کے اندر چلی گئی —— وہاں اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کا جائزہ لیا اور پھر آگے بڑھ کر ایک پتھر کی میز پہ دراز ہو گئی —— مینگ چیانگ نو دن بھر چل چل کے تھک کر اس قدر نڈھال ہو چکی تھی کہ جوں ہی وہ کمر سیدھی کرنے کے لیے میز پہ دراز ہوئی، اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں مندھ گئیں اور وہ گہری نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

سوتے میں اس نے ایک خواب دیکھا —— اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر اس کی جانب آ رہا ہے۔ اس کے چہرے پہ خوشی ناچ رہی ہے اور وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا اس کے قریب آ گیا ہے۔ اس نے آتے ہی خوشی میں مینگ چیانگ نو کو اپنے چوڑے چکلے سینے سے لگا لیا —— وہ اسے پیار کرنے لگا —— مگر پھر جب اس نے اسے یہ بتایا کہ میں مر چکا ہوں تو وہ بری طرح چیخ پڑی —— صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوئی تو اس کی حالت دگر گوں تھی —— ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ نیند کے بعد

تازہ دم ہو جاتی لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ نڈھال ہو رہی تھی۔ اسے بار بار رات کا خواب یاد آ رہا تھا اور اسے اپنا آپ بوجھل محسوس ہو رہا تھا ۔ کبھی وہ اپنے آپ سے کہتی ۔

"کہیں یہ خواب سچا ہی نہ ہو ۔۔۔؟ وان سی لیانگ واقعی نہ مر چکا ہو ۔۔۔؟!"

اور پھر ۔۔۔ دوسرے ہی لمحے وہ خود کو یقین دلاتے ہوئے کہتی ۔

"نہیں نہیں ۔۔۔ یہ سب میرا وہم ہے ۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا!"

اس طرح وہ اس وقت یقین اور بے یقینی میں گرفتار تھی اور اس سے اس کی اداسی میں اور اضافہ ہو گیا تھا ۔۔ تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنے اگلے سفر پہ چلنے کے لیے تیار ہو گئی ۔۔۔ اس وقت وہ دل ہی دل میں اس ظالم بادشاہ کو کوس رہی تھی جس نے اس کے شوہر کی طرح ہزاروں خاندانوں سے ان کے افراد جدا کر دیئے تھے ۔۔۔ ایک بار پھر اس کی ہمت نے اس کے سچے ارادوں کا ساتھ دیا اور وہ وہاں سے اگلی منزل کی طرف چل دی ۔

مینگ چیانگ نو اپنے سفر پہ جا رہی تھی ۔۔ اس پہ صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح اپنے شوہر کے پاس پہنچ جائے ۔۔۔ ایک روز چلتے چلاتے وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچی جو پہاڑی راستے کے ساتھ بنا ہوا تھا ۔ اس ہوٹل کی مالکہ ایک بوڑھی عورت تھی ۔۔ اس نے جب مینگ چیانگ نو کا دھوپ میں تمتماتا ہوا چہرہ اور گرد میں اٹے ہوئے کپڑے دیکھے تو اسے اس پہ بڑا ترس آیا ۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگی، نہ جانے یہ کون مصیبت کی ماری ہے ۔ آخر اس پہ کیا آفت آ پڑی ہے جو یہ اس طرح ویرانوں میں ماری ماری پھر رہی ہے ۔۔؟ اس نے مینگ چیانگ نو سے دریافت کیا ۔

"اے نیک دل عورت ۔۔۔! تم کہاں سے آئی ہو اور کہاں جا رہی ہو ۔۔؟ تمھاری حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ تم طویل سفر کر کے آئی ہو ۔۔؟"

جواب میں اس نے جھکے جھکے سے لہجے میں بتایا ۔

" بادشاہ نے میرے شوہر کو بیگار میں پکڑ لیا ہے ـــ وہ بھی عظیم دیوار تعمیر کرنے والوں میں شامل ہے ۔ میں اس کے لیے کپڑے اور جوتے لے کر جا رہی ہوں کیونکہ میں نے سنا ہے ، وہاں بہت زیادہ سردی پڑتی ہے ۔"

بوڑھی عورت نے اس کی بات سنی اور افسوس کرتے ہوئے بولی ۔

" افسوس ! عظیم دیوار تو یہاں سے ابھی بہت دور ہے !"

پھر اس نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا ۔

" وہاں تک پہنچنے کے لیے کئی دشوار گزار پہاڑوں اور پُر شور دریاؤں کو عبور کرنا پڑے گا ـــ بھلا تم جیسی کمزور جواں عورت وہاں تک کیسے پہنچ پائے گی ـــ ؟"

مگر مینگ چیانگ نو نے جواب میں اسے بتایا کہ ۔

" میں اپنے ارادے کی اٹل ہوں ـــ میں ثابت قدمی سے یہ سفر طے کروں گی خواہ مجھے کتنی ہی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے ـــ میں اپنے شوہر کو کپڑے اور جوتے ضرور پہنچاؤں گی !"

بوڑھی عورت اس کی اس بات سے بڑی متاثر ہوئی ۔ وہ دل ہی دل میں اس کے ارادے کی مضبوطی اور ہمت کی داد دے رہی تھی ۔ اس نے دل خوشی کے ساتھ اس کی آؤ بھگت کی اور مینگ چیانگ نو نے اسی کے ہاں رات بسر کی ـــ دوسری صبح بڑھیا نے اسے ناشتہ کرایا اور ہمدردی کے طور پر تھوڑے فاصلے تک اسے چھوڑنے گئی ۔

" خدا حافظ میری بیٹی ـــ خدا تمھیں اپنے ارادے میں کامیاب کرے !"

" خدا حافظ نیک دل خاتون ـــ تمھاری دعائیں میرے ساتھ ہیں !"

اس طرح مینگ چیانگ نو وہاں سے رخصت ہو کر اپنے اگلے سفر پہ روانہ ہو گئی ۔

ایک بار پھر مینگ چیانگ نو کا سفر جاری و ساری تھا ـــ وہ چلتی رہی

—— یہاں تک کہ چلتے چلاتے ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئی جو پہاڑوں کے درمیان ڈھلانوں میں واقع تھا۔ وہاں کا منظر بھی عجیب و غریب تھا۔ سارے آسمان پر بھورے رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے جن کی وجہ سے روشنی بہت کم تھی۔ تیز آندھی چل رہی تھی اور ہوا اس قدر سرد تھی کہ جسم میں کپکپیاں آ رہی تھیں۔ وہ تنِ تنہا اس علاقے میں چلتی رہی۔ گو وہاں سفر کرنا مشکل ہو رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے اپنے قدم رُکنے نہ دیئے اور برابر آگے بڑھتی رہی۔ اس طرح اس نے کافی فاصلہ طے کر لیا تھا مگر اس پورے علاقے میں اسے کوئی گھر دکھائی نہ دیا۔ نہ کوئی آدم زاد نظر آیا اور نہ کہیں آبادی کے آثار دکھائی دیئے —— اس علاقے میں چاروں طرف اونچی اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی، بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں، یا پھر کہیں چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں۔ اس پہ ستم یہ کہ گہرے اندھیرے کی وجہ سے ساری فضا ایک دبیز پردے کی مانند تھی —— تاریکی کی وجہ سے اب اسے راستہ بھی دکھائی دینا بند ہو گیا تھا۔

"اب میں کہاں جاؤں ——؟"

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے ——؟"

ایک لمحہ کے لیے مینگ چیانگ نو نے اپنے آپ سے سوال کیا مگر اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہاں پہاڑوں کے دامن میں ایک دریا بہہ رہا تھا جس کا پانی سیاہ رنگ کا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے دریا میں پانی کی بجائے تاریکی کا ایک دھارا بہہ رہا ہے۔

"میں کہاں آ گئی ہوں ——؟"

"اب میں کیا کروں ——؟"

اس نے ایک بار پھر اپنے آپ سے سوال کیا اور ایک بار پھر اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ وہاں کھڑے کھڑے سوچنے لگی —— لیکن کب تک ——؟ سوچتے سوچتے جب اس کی عقل نے ساتھ دینا چھوڑ دیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ یہیں کہیں جھاڑیوں کے درمیان رات بسر کر لینی چاہیے۔ وہ دن بھر

دشوار گزار رستوں پر چلتے چلتے نڈھال ہو چکی تھی - اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی - وہاں ہوا اس قدر سرد تھی کہ وہ سردی کی شدت سے کانپ رہی تھی - اس کے روئیں روئیں پر لرزہ طاری تھا —— اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ بڑے دُکھ سے سوچنے لگی -

" اس قدر شدید سرد موسم میں ، نہ جانے اس کے شوہر کا کیا حال ہوگا -؟"

اتنا سوچتے ہی اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہو شوہر کی یاد آتے ہی اس کے سینے میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی اور وہ تلملا کر رہ گئی - مگر وہ کیا کر سکتی تھی —؟ مجبوری نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا - یہی کچھ سوچتے سوچتے وہ جھاڑیوں کے درمیان لیٹ گئی تاکہ کسی طرح رات بسر کرلے اور صبح پھر اپنے سفر پر چل دے -

دوسری صبح جب مینگ چیانگ نو کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے چاروں طرف کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی - اس نے دیکھا ، ہر طرف برف ہی برف تھی — تمام گھاس اور جھاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں - چٹانیں اور پتھر برف پوش ہو چکے تھے - یہاں تک کہ خود اس کے جسم پر برف کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی - وہ گھبرا کر جلدی سے اُٹھی اور اردگرد نظریں دوڑائیں مگر وہاں تو برف کے سوا کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی -

" اب میں اپنا سفر کیسے جاری رکھ سکوں گی —؟"

وہ خاموش کھڑی انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ عین اس وقت ایک کوّا فضا میں سے نیچے آیا - وہ نیچی پرواز کرتا ہوا اس کے قریب آکر زمین پر بیٹھ گیا - کوّے نے اسے دیکھا اور دوبارہ کائیں کائیں کر کے وہاں سے اُڑ کر تھوڑے فاصلے پر جا بیٹھا — وہاں بیٹھ کر اس نے پھر دو بار کائیں کائیں کی اور یوں بیٹھ گیا جیسے کسی کا منتظر ہو — مینگ چیانگ تو پہلے تو حیران کھڑی اسے دیکھتی رہی لیکن پھر اس نے اندازہ کیا کہ کوّا اسے اپنی جانب بُلا رہا ہے — یہ سوچ کر وہ

اسی طرف چلنے لگی جس طرف کوا چھوٹی چھوٹی اڑانیں لگاتا جارہا تھا حقیقت یہ تھی کہ اس وقت کوّے کی موجودگی سے اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی ۔ وہ کوّے کی رہنمائی میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ گانے لگی ۔

"میرے چاروں طرف برف کا دبیز اور تیز بھنور ہے ۔
میں مینگ چیانگ نو — موسم سرما کے کپڑے اٹھائے بڑی مشکل سے چل رہی ہوں ۔
افسوس ! صرف ایک بھوکا کوا میرا رہنما ہے ۔
عظیم دیوار یہاں سے بہت دور ہے اور میں اس سے بہت دور ہوں "

اسی طرح کوّے کی رہنمائی میں چلتے چلتے اس نے وہ علاقہ پار کر لیا اور ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں دریا ایک چھوٹے چشمے کی طرح تھا ۔ اب اسے پار کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا ۔ یہاں پہنچ کر کوّے نے ایک لمبی اڑان لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔ مینگ چیانگ نو ایک لمحہ کے لیے وہاں رکی اور پھر دریا عبور کر کے اپنے اگلے سفر پہ روانہ ہو گئی ۔

مینگ چیانگ نو سارا دن اداس اور غم زدہ اپنے سفر پہ چلتی رہی — یہاں تک کہ وہ عظیم دیوار کے قریب پہنچ گئی ۔ جوں ہی اس نے عظیم دیوار کو دیکھا ، اس کے جذبات میں ہل چل سی مچ گئی ۔ وہ اپنے آپ پہ قابو نہ رکھ سکی ۔ خوشی سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ اس کے سامنے عظیم دیوار کسی ناگن کی طرح بل کھائے ہوئے پہاڑوں پہ دور تک پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی ۔ وہ یہ سوچ کر کس قدر خوش تھی کہ آخر کار وہ عظیم دیوار کے پاس پہنچ گئی ہے ۔ اب وہ اپنے شوہر سے مل سکے گی ۔ اسے گرم کپڑے دے گی تاکہ وہ سردی سے محفوظ رہ سکے مینگ چیانگ نو جس جگہ پہنچی تھی ، وہاں ٹھنڈی اور تیز ہوا آندھی کی طرح چل رہی تھی ۔ سردی اس قدر زیادہ تھی کہ رونگٹے روئیں میں محسوس ہو رہی تھی ۔ پہاڑوں کا سلسلہ دور تک

پھیلا ہوا تھا اور ان پر سوکھی گھاس کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نہ کہیں درخت نظر آتا تھا اور نہ کہیں ہریالی کا نام و نشان تھا۔ ہاں، اتنا ضرور تھا کہ وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو عظیم دیوار کے سامنے جمع تھا۔ بے شمار لوگ بے ترتیب گروہوں میں بٹے ادھر ادھر نظر آ رہے تھے۔ یہ وہی بد قسمت لوگ تھے جنھیں بیگار میں پکڑ لیا گیا تھا۔ انہیں ملک کے دُور دراز حصّوں سے زبردستی یہاں لایا گیا تھا تاکہ وہ عظیم دیوار تعمیر کریں۔

"آخر میری تمنا پوری ہو گئی —— اب میں اپنے شوہر سے مل سکوں گی۔ اسے وہ کپڑے دے سکوں گی جو میں اس کے لیے لائی ہوں!"

مینگ چیانگ نو نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے سوچا اور عظیم دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ دیوار کے قریب پہنچ گئی اور ان لوگوں میں اپنے شوہر کو تلاش کرنے لگی جو وہاں مشقت کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر لوگوں کے درمیان وان ہسی لیانگ کو ڈھونڈتی رہی اور جب وہ اسے کہیں نظر نہ آیا تو وہ اس کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"کیا تم نے وان ہسی لیانگ کو دیکھا ہے ——؟"

"کیا تم بتا سکتے ہو، وان ہسی لیانگ کہاں ہے ——؟"

"مجھے بتاؤ، وان ہسی لیانگ کس طرف ہے ——؟"

وہ مختلف بیگاری لوگوں سے پوچھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی مگر کوئی شخص اس کے شوہر کے بارے میں نہیں بتا رہا تھا، دراصل کوئی اس کے بارے میں جانتا ہی نہ تھا ایک وان ہسی لیانگ ہی کیا، وہاں تو کوئی کسی دوسرے کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے —— ؟ مینگ چیانگ نو اسی طرح لوگوں سے پوچھتی پاچھتی عظیم دیوار کے سرے تک پہنچ گئی —— اس نے وہاں بے شمار کمزور اور زرد چہرے والے مردوں کو دیکھا جو بیگار میں لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف کچھ دُور بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں —— یہ لاشیں ان بدنصیبوں کی تھیں جو ظلم کا شکار ہو کر مر چکے تھے اور اب انہیں کوئی دیکھنے والا تک نہیں تھا۔ کسی کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی جو ان کی طرف توجہ دیتا —— مینگ چیانگ نو کے لیے یہ منظر بڑا کربناک تھا۔ وہ

اپنے شوہر کے بارے میں سوچ سوچ کر اور بھی دلگیر ہو رہی تھی۔

"نہ جانے اس کا کیا حال ہے ——؟"

"نہ جانے وہ کہاں ہے ——؟"

وہ یہ سوچ سوچ کر اداس ہو رہی تھی۔ پھر وہ اپنی بدقسمتی اور محرومی پر آنسو بہانے لگی۔ ضبط کے باوجود اس کے آنسو نہ رُک سکے اور آنکھوں سے ڈھلک کر رخساروں پہ بہنے لگے۔ اب وہ اسی حالت میں اپنے شوہر کو تلاش کر رہی تھی۔

مینگ چیانگ نو نہ جانے کب تک اپنے شوہر کو ڈھونڈتی رہی —— آخر اسے وہ حقیقت بھی معلوم ہو گئی جس کے لیے اس نے بڑے دُکھ اُٹھائے تھے اور جو اس کا سب سے بڑا دُکھ تھا —— یہ حقیقت اتنی تلخ تھی کہ وہ اسے جاننے کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ اس کی تمام اُمیدوں، تمام آرزوؤں نے جیسے دم توڑ دیا تھا —— اسے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر ایک عرصہ ہوا مر چکا ہے۔ وہ ناقابلِ برداشت بیگار کا زیادہ دن مقابلہ نہ کر سکا اور موت کی گود میں جا سویا۔ اسے لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ عظیم دیوار تعمیر کرتے کرتے جہاں اس نے دم توڑا تھا، اسے وہیں پہ دفن کر کے اوپر دیوار چُن دی گئی تھی، اس طرح اب اس کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہا۔ جب مینگ چیانگ نو نے یہ غمناک خبر سُنی تو وہ دُکھ سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی اور جہاں تھی وہیں گر پڑی۔ اسے بے ہوش ہو کر گرتے دیکھ کر چند لوگ جو دیوار تعمیر کرنے میں مصروف تھے، اس کی طرف لپکے۔ وہ سب اسے ہوش میں لانے کے جتن کرنے لگے۔ بڑی دیر کے بعد وہ ہوش میں آئی اور جوں ہی اسے ہوش آیا وہ زار و قطار رونے لگی —— اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ اس کے لبوں پہ آہوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسے اس بُری طرح روتے دیکھ کر بہت سے بیگاری بھی اس کے ساتھ رونے لگے۔ وہ خود بھی دُکھ کے مارے ہوئے تھے اور ان سے مینگ چیانگ نو کا دُکھ بھی نہ دیکھا گیا —— اس کی گریہ زاری میں اس قدر کرب تھا کہ کوئی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ قدرت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی —— اچانک ایک گرج دار آواز فضا

میں گونجی اور اس کے ساتھ ہی عظیم دیوار کا دو سو میل سے زیادہ حصہ ریزہ ریزہ ہو کر نیچے گر پڑا ۔ دیوار کا گرنا تھا کہ اینٹوں، پتھروں کے ٹکڑوں اور ریت کے بگولے سے اٹھے اور ساری فضا میں ایک طوفان سا آ گیا ۔ یہ ایک عجیب و غریب واقعہ تھا ۔ ایک نہ ہونے والا منظر تھا ۔ سب لوگ حیران و پریشان تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے ۔

"یہ سب کچھ مینگ چیانگ نو کے آنسوؤں کی وجہ سے ہوا ہے ۔ اس کی گریہ وزاری سے عظیم دیوار گری ہے ۔ وہ اس کا دُکھ دیکھ نہیں سکی !"

وہاں موجود ہر شخص ایک دوسرے سے یہی کہہ رہا تھا اور ہر ایک کے دل میں ظالم بادشاہ کے خلاف نفرت کا جذبہ اور بڑھ گیا تھا ۔ اسی کے ظلم و ستم کی وجہ سے مینگ چیانگ نو کا شوہر اور اس جیسے ہزاروں دوسرے لوگ موت کی نیند سو گئے تھے ۔ اس وقت تمام لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ اس ظالم بادشاہ نے ہمیں زبردستی یہاں بیگار میں لگا رکھا ہے ۔ ہمارے اَن گنت ساتھی ہم سے بچھڑ گئے ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی مصائب میں گرفتار ہیں ۔

ادھر جوں ہی یہ خبر بادشاہ کو پہنچی کہ مینگ چیانگ نو کے آنسوؤں اور گریہ وزاری سے عظیم دیوار گر کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہے تو وہ بہت حیران ہوا ۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ ؟"

اس نے تعجب سے خبر لانے والوں سے پوچھا ۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آ سکتی تھی ۔ ایک ایسی انہونی بات جو آج تک نہ ہوئی تھی اور نہ کسی نے کبھی اس قسم کا واقعہ سُنا تھا ۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ خود بادشاہ بھی حیرت کی تصویر بن گیا ۔ اس نے درباریوں کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے کہا ۔

"یہ ناممکن بات ہے ۔ !"

"جہاں پناہ ۔ یہ بات بالکل سچ ہے ۔ حضور یقین کریں ایسا ہی ہوا

ہے —!"

خبر لانے والوں نے سر جھکا کر دست بستہ عرض کیا۔

"ہمیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا — ہم خود جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے —؟!"

بادشاہ نے اتنا کہا اور اپنے مصاحبوں کے ساتھ اس طرف روانہ ہو گیا جہاں عظیم دیوار تعمیر ہوئی تھی اور جہاں اب ملبے کے ڈھیروں کے سوا کچھ نہ تھا — یہی سب کچھ بادشاہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا — وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ عورت کس قسم کی ہے جس کے آنسوؤں کی وجہ سے اس قدر مضبوط دیوار نیچے آ گری ہے۔ جس کی گریہ وزاری سے قدرت بھی متاثر ہو گئی ہے — انہی خیالات میں اُلجھا ہوا وہ مصاحبوں کے جلو میں جا رہا تھا — پھر جب وہاں پہنچ کر اس نے مینگ چیانگ نو کو دیکھا تو دنگ رہ گیا — اس کے سامنے ایک حسین و جمیل عورت کھڑی تھی — اتنی حسین کہ اس نے آج تک ایسی خوب صورت عورت نہ دیکھی تھی۔ وہ ایسے دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی پری زمین پہ آ گئی ہو — بادشاہ پہلی نظر ہی میں اس کے حُسن و جوانی پہ ہزار جان سے فدا ہو گیا — وہ اس کی خوب صورتی سے اس قدر سحر زدہ ہو گیا کہ دیوار گرنے کی وجہ بھی دریافت کرنا بھول گیا — اس وقت دُنیا کی ہر چیز اس کی نظروں سے اوجھل تھی۔ صرف مینگ چیانگ نو تھی اور اس کا دل میں اُتر جانے والا حُسن تھا جسے وہ ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ چند لمحوں تک مسحور ہوا اسے دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ کر اسے کہنے لگا۔

"ما بدولت چاہتے ہیں کہ تم ہماری بیوی بن جاؤ —؟"

جوں ہی بادشاہ نے یہ جملہ کہا۔ مینگ چیانگ نو کو ایسے لگا جیسے اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ہو — وہ بادشاہ کے ظلم و ستم سے اچھی طرح واقف تھی — اس نے اس کے شوہر اور اس جیسے ہزاروں دوسرے لوگوں کو موت کی نیند سُلا دیا تھا — اَن گنت لوگوں کو بیگار میں گرفتار کر رکھا تھا اور ان پہ طرح طرح

کے مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ وہ یہ سب کچھ جانتی تھی اور اس سے دلی نفرت کرتی تھی۔ بھلا وہ اس سے شادی کیوں کر کر سکتی تھی ——؟ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے اس طرح خاموش دیکھ کر بادشاہ نے پھر کہا۔

"ہمیں جواب دو کہ تمھیں ہماری بیوی بننا منظور ہے یا نہیں ——؟"

مینگ چیانگ نو نے دل میں سوچا —— اگر میں نے انکار کیا تو یہ زبردستی مجھے اپنے حرم میں ڈال لے گا اور میں کچھ بھی نہ کر سکوں گی اس لیے انکار کرنے کی بجائے کوئی چال چلنی چاہیے —— اس نے بڑے ادب سے شیریں لہجے میں جواب دیا

"میں حضور سے شادی کرنے کو تیار ہوں مگر میری تین شرطیں ہیں یہ تینوں شرطیں پہلے پوری ہونی چاہئیں ——؟"

بادشاہ تو اسے ہر صورت میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے تین شرطیں کیا، وہ تو ہزار شرطیں پوری کرنے پر تیار تھا۔ اس نے جب مینگ چیانگ نو کی زبان سے یہ سنا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے تو خوشی میں دیوانہ سا ہو گیا۔ اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"ہمیں جلدی بتاؤ تمھاری تین شرطیں کون سی ہیں ——؟ ہم انھیں ضرور پورا کریں گے ——؟"

جواب میں مینگ چیانگ نو بڑے اطمینان سے بولی۔

"پہلی شرط تو یہ ہے کہ آپ میرے شوہر کی لاش نکلوا کر اسے سونے کا کفن پہنائیں سونے کے اس کفن پر چاندی کی چادر چڑھی ہونی چاہیے اور پھر آپ اسے دفن کریں ——؟"

"اور دوسری شرط کیا ہے ——؟"

بادشاہ سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے مینگ چیانگ نو کی بات کاٹتے ہوئے دریافت کیا —— اس پر وہ اسی اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

"میری دوسری شرط یہ ہے کہ آپ کے تمام وزیر اور جنرل میرے شوہر کے

سوگ اور جنازے میں شریک ہوں ۔۔۔ ؟"

"جلدی کرو ۔۔۔ اپنی تیسری شرط بھی بیان کرو ۔ ؟"

بادشاہ اس قدر بے صبرا ہو رہا تھا کہ وہ ایک ساتھ ہی اس کی تینوں شرطیں معلوم کر لینا چاہتا تھا، مگر مینگ چیانگ نو بڑے تحمل سے بات کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"اور میری تیسری شرط یہ ہے کہ حضور خود بھی میرے شوہر کے جنازے میں اس طرح سوگوار شریک ہوں جیسے اس کا بیٹا ہوتا تو وہ شریک ہوتا ۔۔۔ ؟"

بادشاہ کی حالت یہ تھی کہ وہ ہر قیمت پر مینگ چیانگ نو کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس کے لیے یہ تین معمولی شرطیں پوری کرنا کیا مشکل تھا ۔ ؟ اس نے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تمھاری تینوں شرطیں منظور ہیں ۔۔۔ ہم انھیں پورا کریں گے !"

بادشاہ نے اسی وقت حکم دیا کہ اس سلسلے میں تمام ضروری انتظامات فوری طور پر مکمل کیے جائیں ۔ حکم کی دیر تھی کہ ہر چیز تیار کر دی گئی ۔ وان ہی لیانگ کی لاش بھی نکال لی گئی اور اسے دفن کرنے کے لیے سونے کا کفن بھی تیار کر لیا گیا جس پر چاندی کی چادر چڑھی ہوئی تھی ۔ بادشاہ نے اپنے تمام وزیروں ، مصاحبوں اور رعیتوں کو جنازے میں شریک ہونے کا حکم دیا اور خود بھی تابوت کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تابوت کے ساتھ ساتھ مینگ چیانگ نو اور بادشاہ چل رہے تھے اور ان کے پیچھے دوسرے لوگ تھے ۔ بادشاہ دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ اب وہ حسین دلہن مینگ چیانگ نو کو اپنے حرم میں داخل کر لے گا اور کچھ روز بڑے عیش میں گزارے گا۔ جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے میں بھی اس کی آنکھوں کے آگے مینگ چیانگ نو تھی اور بس ۔ وہ بار بار اپنے آپ کو تسلیاں دے رہا تھا۔

"وہ وقت دور نہیں جب یہ میری بیوی بن جائے گی ۔۔۔ پھر میں ہوں گا اور اس کا حسن ۔ اس کی جوانی پر میرا قبضہ ہو گا !"

مینگ چیانگ نو کی شرائط کے مطابق اس کے شوہر کی تمام آخری رسومات ادا کر دی گئیں ۔ اس نے جو کچھ کہا، وہی کچھ کیا گیا ۔ جیسے چاہا اسی طرح ہوا ۔ جوں ہی اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر کو اس کی شرائط کے مطابق دفن کر دیا گیا ہے تو وہ ہولے سے آگے بڑھی اور پتیا رسم پوری کرنے کے لیے شوہر کی قبر پہ جبیں سائی کے لیے جھک گئی ۔ اس وقت وہ زار و قطار رو رہی تھی ۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا اور وہ ہچکیاں لے رہی تھی ۔ وہ کتنی دیر تک، اسی طرح قبر پہ جھکی روتی رہی اور تمام لوگ سوگوار کھڑے اسے دیکھتے رہے ۔ پھر اچانک، وہ بڑی تیزی سے اٹھی اور پلک جھپکتے میں قبر کے قریب ہی بہتے ہوئے دریا میں کود گئی ۔ بادشاہ نے یہ دیکھا تو تلملا گیا ۔ اسے اپنی تمنائیں خاک میں ملتی ہوئی دکھائی دینے لگیں ۔ اس نے اسی وقت حکم دیا

"اس عورت کو فوراً دریا میں سے باہر نکالا جائے !"

لیکن پیشتر اس کے کہ لوگ اسے دریا میں سے نکالنے کے لیے پانی میں کودتے مینگ چیانگ نو آنکھ کے پلکارے میں ایک خوب صورت روپہلی مچھلی کے روپ میں بدل گئی ۔ اور پھر ۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیرتی ہوئی دریا کے گہرے نیلے اور سبز پانی میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی ۔

سُرخ اور سبز پھُول

WIVES IN THE MIRRORS



یہ چین کے ایک دُور دراز علاقے کی بات ہے۔ اس علاقے میں ایک بہت بڑا میدان تھا۔ یہ میدان اس قدر لمبا چوڑا تھا کہ اگر سرپٹ دوڑنے والا گھوڑا بھی اسے پار کرنا چاہے تو دس روز تک مسلسل دوڑنے پر بھی اس کو عبور کرنا ممکن نہ تھا۔ بظاہر اس پہ وسیع آسمان چھایا ہوا نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں یہ اس سے بھی کہیں زیادہ وسیع و عریض دکھائی دیتا تھا۔ اس قدر لمبا چوڑا میدان شاید ہی روئے زمین پہ کہیں واقع ہو۔ وہاں سے جنوب مغرب میں پھیلے ہوئے دُھندلے افق میں سرسبز پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس وسیع میدان میں کئی جگہوں پہ چھوٹے بڑے بہت سے گاؤں آباد تھے انہی بستیوں اور دیہاتوں میں سے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں ایک نیک دل بُڑھیا رہتی تھی ـــ اس بڑھیا کے دو خوب صورت اور ذہین نوجوان بیٹے تھے جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بڑھیا کو اپنے دونوں بیٹوں کی شادی کی فکر تھی۔ اس بڑھاپے میں اس کی یہی ایک تمنا تھی ـــ وہ دن رات ان ہی کے بارے میں سوچتی رہتی کہ کسی طرح ان کی شادی ہو جائے، پھر ان کے ہاں اولاد ہو اور میں اپنے پوتوں اور پوتیوں میں ہنسوں کھیلوں۔ اس کے برعکس دونوں نوجوان اپنی شادی کے لیے بالکل فکرمند نہیں تھے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کی بوڑھی ماں اپنے دل و دماغ میں ان کے بارے میں کیا منصوبے بنا رہی ہے ـــ دراصل دونوں نوجوان ابھی شادی کرنا

ہی نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رشتہ تلاش کرنے والی نائین نے اپنی طرف سے بے انتہا کوشش کی۔ وہ ان کے لیے موزوں لڑکیوں کی تلاش میں ادھر ادھر ماری ماری پھری تاکہ ان کی پسند کا کوئی گھر مل جائے مگر سب بے سود — اگر کوئی لڑکی ملتی بھی تو لڑکے اسے ناپسند کر دیتے یا ماں کو وہ گھر پسند نہ آتا — اسی طرح یہ تمام کوششیں بے فائدہ ثابت ہوئیں اور ماں کی تمنا دل ہی دل میں کروٹیں لیتی رہی۔

جوں جوں دن بیت رہے تھے بڑھیا کو اپنے بیٹوں کی جوانی اور اپنے بڑھاپے کا اور زیادہ خیال آ رہا تھا۔ ہر بیتنے والے دن کے ساتھ اپنی ڈھلتی عمر کو دیکھ دیکھ کر اس کی یہ تمنا اور شدید ہوتی جا رہی تھی۔ اسے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ میں نہ جانے کب تک زندہ رہوں۔ زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں، کسی طرح اپنے جیتے جی بیٹوں کا گھر آباد ہوتے دیکھ لوں۔ اسی احساس نے اس کے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا تھا۔

ایک رات وہ گہری نیند سو رہی تھی کہ اچانک اسی فکر میں سوتے سے بیدار ہو گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ ہولے سے اپنے بستر سے اُٹھی اور دبے دبے پاؤں رکھتی ہوئی کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی۔ اگرچہ اس وقت آسمان پر چمکتے ہوئے اَن گنت ستارے چھٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر اس کے باوجود چاروں جانب گھُپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ بڑھیا نے بڑی حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے اپنے آپ سے بولی۔

"اے میرے بیٹو!"

وہ بڑی دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم تمھیں کس قسم کی لڑکیاں پسند ہیں —— کاش میں تمھارے دل کی بات جان سکتی"

اگرچہ یہ بات بڑھیا نے انتہائی دھیمے لہجے میں کہی تھی لیکن رات اس قدر خاموش اور پُرسکون تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی یہ بات آسمان پر بکھرے ہوئے

ستارے بھی سُن رہے ہیں ۔۔۔ پھر اس وقت تو بڑھیا کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اچانک جنوب مغرب کی جانب سے روشنی کا ایک بہت بڑا گولا سا اُٹھا اور آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہونے لگا۔ روشنی کا یہ گولا پورے چاند سے بھی کہیں زیادہ بڑا تھا اور دھیرے دھیرے اس کی طرف آ رہا تھا۔ بڑھیا یہ سب کچھ بُت بنی کھڑی دیکھ رہی تھی۔ روشنی کا گولا قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل پاس آکر اس کے مکان کے صحن میں اس طرح گرا کہ چاروں طرف چوندھیا دینے والی روشنی پھیل گئی۔ روشنی اس قدر تیز تھی کہ اس کی بوڑھی آنکھیں اس کی تاب نہ لا سکیں۔ اس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ چند لمحوں تک آنکھیں بند کیے سہمی ہوئی کھڑی رہی ۔۔۔ اور پھر جب اس نے ہمت کر کے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اس کے تعجب میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس نے دیکھا، اس کے سامنے برف جیسی سفید داڑھی مونچھوں والا ایک بزرگ کھڑا تھا۔ اس کے سر کے سفید اور لمبے بال لٹک رہے تھے اور اس کا نورانی چہرہ چمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی جس کے سر پہ اژدھا کا سر بنا ہوا تھا اور اس کے سراپا سے تقدس جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے کے گرد فضا میں نور کا ایک ہالہ بنا ہوا تھا جس نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ بزرگ کے لبوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی نورانی فرشتہ آسمان سے اُتر کر زمین پہ آگیا ہو ۔۔۔ بڑھیا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر اس کی حیرانی کا یہ عالم تھا کہ جیسے پتھر کی بن گئی ہو۔ وہ نہ جانے کب تک یوں ہی حیران رہتی کہ اتنے میں اس بزرگ نے مسکراتے ہوئے اپنے لب کھولے۔ وہ بڑی میٹھی آواز میں بولا۔

"مجھ سے ڈرو نہیں ۔۔۔ میں تمھارے لیے ایک خوش خبری لایا ہوں!"

"خوش خبری ۔۔۔؟"

بڑھیا نے اور بھی زیادہ حیران ہوتے ہوئے ہولے سے اس طرح کہا جیسے اپنے آپ سے سوال کر رہی ہو ۔۔۔ بزرگ کے تسلّی دینے پر اس کا خوف قدرے

کم ہو گیا تھا۔

"ہاں —! خوش خبری!"

اس بزرگ نے اپنی سریلی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے بیٹوں سے ان کی بیویوں کا تعارف کرا دوں —!"

جب وہ بات کرتا تھا تو اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دیتا جس سے اس کی لمبی داڑھی اور سر کے برف سے سفید بال ہل ہل جاتے تھے۔

"میرے بیٹوں کی بیویاں —؟"

بڑھیا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں —! تمھارے دونوں بیٹوں کی پسند کی بیویاں۔"

اس بزرگ نے بڑے اطمینان اور دھیمے لہجے میں جواب دیا — لیکن بڑھیا کو اس کی بات پہ یقین نہیں آیا۔ اسے یہ انہونی سی بات لگ رہی تھی کیوں کہ وہ اپنے بیٹوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کے ہاں اب تک اتنے رشتے آچکے تھے، بیٹوں کو اتنی لڑکیوں کے بارے میں بتایا گیا تھا لیکن انھیں ان میں سے ایک بھی لڑکی پسند نہ آئی تھی — یہی کچھ سوچ کر اس نے بڑے ادب سے بزرگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے فرشتہ صفت انسان —! یہ بات مجھے ناممکن نظر آرہی ہے —"

وہ لمحہ بھر کو رکی اور پھر بولی۔

"مجھے افسوس ہے، تمھاری کوشش بیکار جائے گی کیوں کہ میں اپنے بیٹوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ انھیں کوئی لڑکی پسند نہیں آسکتی۔ شاید وہ کسی لڑکی سے خوش نہ رہ سکیں۔"

بڑھیا نے یہ بات بڑی مایوسی سے کہی اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"بہر حال — مجھے بتاؤ وہ کہاں رہتی ہیں —؟ رشتہ تلاش کرنے والی کون

ہے جسے ان تک بھیجا جائے — ؟؟"

بڑھیا کی یہ بات سُن کر وہ بزرگ قہقہہ مار کر ہنسا۔ وہ جب تک ہنستا رہا اس کی لمبی داڑھی اور سر کے سفید بال ہوا میں اس طرح لہراتے رہے جیسے اندھیرے میں کرنیں لہرا رہی ہوں۔ پھر وہ بڑھیا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"ان کے لیے رشتہ تلاش کرنے والی کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی شادی کی تقریب کرنی لازمی ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس دو آئینے ہیں —— ان آئینوں میں تمھاری ہونے والی بہوئیں دیکھی جا سکتی ہیں —— یہ آئینے ہی رشتہ تلاش کرنے کے لیے کافی ہیں۔"

یہ بات بڑھیا کے لیے اور بھی حیرانی کا باعث تھی — حقیقت یہ ہے کہ آج تو اس کے لیے ہر بات عجیب اور انوکھی تھی —— یہ کیسے ہو سکتا ہے —؟ بھلا آئینوں میں میرے بیٹوں کی بیویاں کہاں سے آ گئیں ؟ اس نے اپنے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ اسے جیسے اس انہونی بات پر یقین نہ آرہا ہو۔ وہ بزرگ سے کہنے لگی۔

"یہ کیسے ممکن ہے ——؟ میں اس پر کیوں کر یقین کر لوں —؟؟"

جواب میں بزرگ پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔

"دل میں یہ مت خیال کرو کہ یہ محض تصوّر ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے —— میں تمھیں حقیقت بتا رہا ہوں۔ تمھارے دونوں بیٹوں کی پسند کی بیویاں ان آئینوں میں دکھائی دیں گی"

بزرگ نے اتنا کہہ کر بڑھیا کو غور سے دیکھا اور پھر اسے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

"ہر سال کے تیسرے چاند کے تیسرے روز، ٹھیک آدھی رات کے وقت اگر تمھارے بیٹے ان آئینوں کا رُخ جنوب مغرب کی جانب کریں گے تو انھیں روشنی کی ایک پگڈنڈی دکھائی دے گی —— روشنی کی یہ پگڈنڈی اس جانب

رہنمائی کرے گی جہاں تمھاری ہونے والی بہوئیں رہتی ہیں"۔

اس فرشتہ صفت نورانی چہرے والے بزرگ نے اتنا کہہ کر دو چھوٹے چھوٹے گول آئینے نکالے اور بڑھیا کو دے دیتے۔ اس کے بعد بڑھیا نے دیکھا کہ پلک جھپکتے ہیں وہ بزرگ غائب تھا۔ اس کی بجائے چوندھیا دینے والی روشنی کا ایک گولا سا اٹھا اور شہاب ثاقب کی طرح بڑی تیزی سے جنوب مغرب کی طرف چلا گیا۔ بڑھیا حیران کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دونوں آئینے تھے اور چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے روشنی کا گولا تیزی سے بڑھتا ہوا افق کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

بڑھیا ابھی تک گم سم کھڑی تھی۔ وہ دُور افق کے اندھیرے میں ٹکٹکی لگائے اس جگہ دیکھ رہی تھی جہاں ابھی ابھی روشنی کا گولا غائب ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے ایک خواب سے کم نہ تھا۔ واقعی اسے بار بار یوں احساس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے لیکن جب وہ اپنے ہاتھ میں دو آئینے دیکھتی تو اسے اس کی حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا — وہ کافی دیر تک اسی حالت میں وہاں کھڑی رہی اور پھر خیالات میں کھوئی ہوئی آہستہ آہستہ کمرے میں آگئی۔ جوں ہی وہ گھر کے اندر داخل ہوئی، اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں بیٹے بھی جاگ رہے تھے۔ انھوں نے ماں کو اس طرح آدھی رات کے وقت جاگتے اور حیران دیکھا تو دریافت کیا۔

"ماں! کیا بات ہے —؟ تم اس قدر چُپ چاپ کیوں ہو —؟"

اس وقت اگر وہ یہ سوال نہ بھی کرتے جب بھی ان کی ماں اپنی حیرانی کا سبب ضرور بتا دیتی — اور اب جب کہ انھوں نے پوچھ ہی لیا تھا تو بڑھیا نے اپنے دل و ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے انھیں بتانا ضروری جانا۔

"صبر کرو — میں تمھیں سب کچھ بتاتی ہوں — اس کے بعد اس نے ان کو ساری بات بتائی کہ کس طرح وہ کمرے سے نکل کر باہر گئی کیسے جنوب مغرب

کی سمت سے ایک روشنی کا گولا آیا، پھر اس نے سفید ریش بزرگ کا روپ دھارا — اس کے بعد اس بزرگ سے کیا کیا باتیں ہوئیں، اس نے دونوں بیٹوں کے لیے دو آئینے دیئے۔ اور پھر جس جانب سے آیا تھا روشنی کی شکل میں اسی جانب غائب ہو گیا — بڑھیا نے بیٹوں کو ساری باتیں بتا دیں تھیں مگر یہ نہیں بتایا کہ ان لڑکیوں تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے —؟

بڑھیا دونوں بیٹوں کو سارا واقعہ بتا رہی تھی اور وہ حیرانی سے سُن رہے تھے۔ واقعی ان کے لیے ماں کی باتیں ناقابل یقین تھیں — انھوں نے آج تک کسی شخص سے اس قسم کا قصہ نہیں سُنا تھا لیکن جب انھوں نے یہ سُنا کہ بزرگ کے دیئے ہوئے آئینوں میں ان کی ہونے والی بیویاں دکھائی دیں گی تو وہ بے تاب سے ہو گئے — انھوں نے بڑے اشتیاق سے بیک آواز ہو کر پوچھا۔

"ماں — وہ آئینے کہاں ہیں —؟"

"ٹھہرو بیٹو — تھوڑا صبر کرو!"

اتنا کہہ کر بڑھیا نے وہ دونوں آئینے نکالے جو اسے سفید ریش اور نورانی چہرے والے بزرگ نے دیئے تھے۔ اس نے دونوں بیٹوں کو ایک ایک آئینہ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ لو — یہ تم لوگوں کی امانت ہیں"

وہ تو پہلے ہی سے آئینہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔ چنانچہ دونوں نے اپنا اپنا آئینہ لے لیا — پہلے بڑے بیٹے نے اپنا آئینہ ہاتھ میں لے کر اس میں دیکھا تو اسے سُرخ لباس میں ملبوس ایک حسین لڑکی دکھائی دی۔ لڑکی اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی — جوں ہی بڑے بھائی نے اسے غور سے دیکھا لڑکی نے اپنے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک سُرخ پودے کو دیکھنے لگی۔ وہ لڑکی اس قدر خوب صورت تھی کہ لڑکے نے آج تک اتنی خوب صورت لڑکی نہ دیکھی تھی — اس نے خوش ہو کر ماں سے کہا۔

"ماں — ! کیا تم نے دیکھا، آئینے میں ایک خوب صورت لڑکی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے — ؟"

وہ خوشی اور مسرت میں اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا اور کہنے لگا۔

"ماں — ! واقعی یہ لڑکی میرے لیے ہے — یہ مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے اس سے شادی کرنے کی اجازت دو — !"

اس کی ماں پریشان تھی کہ کیا جواب دے — ؟ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ نہ جانے یہ لڑکی کون ہے ؟ کس کی بیٹی ہے ؟ کہاں رہتی ہے — ؟ پھر یہ کہ اسے کیونکر حاصل کیا جاسکتا ہے — ؟ یہی کچھ سوچ کر اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہی۔

بڑے بھائی کی کیفیت دیکھ کر چھوٹے بھائی کا اشتیاق بھی بڑھ گیا — اس نے بھی اپنا آئینہ لے کر اس میں دیکھا تو ایک حسین و جوان لڑکی سبز لباس پہنے ہوئے کھڑی نظر آئی۔ وہ اسے مسکرا مسکرا کے دیکھ رہی تھی۔ اس نے لڑکے کو پیار سے دیکھا اور پھر سر جھکا کر ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک چھوٹے سے سبز پودے کو دیکھنے لگی — چھوٹا بھائی بھی آئینے میں ایک حسین لڑکی کو دیکھ کر بے تاب ہوگیا وہ جلدی سے اپنی ماں سے کہنے لگا۔

"ماں — ! تم نے دیکھا — لڑکی بڑے پیار سے مجھے دیکھ رہی ہے ؟"

خوشی اور مسرت میں وہ سانس لیے بغیر اپنی ماں سے کہے جا رہا تھا۔

"ماں — ! مجھے یقین ہے، جس طرح مجھے اس سے پیار ہوگیا ہے، اسی طرح وہ بھی مجھ سے پیار کرنے لگی ہے — تم نے دیکھا نہیں — وہ ہنس ہنس کر مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔"

بڑھیا کا چھوٹا بیٹا بے انتہا خوش ہو رہا تھا — وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس کی ماں اس کی باتوں کا جواب بھی دے رہی ہے یا نہیں — ؟ وہ صرف اپنے دل کی کہے جا رہا تھا — اس نے بڑی بے تابی سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ماں — ! ہمیں اجازت دو تاکہ ہم دونوں شادی کر کے میاں بیوی بن جائیں — ؟"

ماں نے دیکھا، دونوں بیٹوں کی کیفیت ایک ہی سی تھی ــــ وہ اپنے دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہی تھی اور اداس بھی تھی ــــ خوش اس لیے تھی کہ چلو، اس کے بیٹوں کو لڑکیاں پسند تو آئیں ــــ اس کی جو تمنا پوری نہیں ہو رہی تھی، اس کے پورا ہونے کا امکان پیدا ہو رہا تھا ــــ اور اداس اس لیے تھی کہ وہ ان لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی ــــ کون ہیں ــــ ؟ کہاں ہیں ــــ ؟ اور ان تک پہنچنے کی کیا سبیل ہے ــــ ؟ اسے تو ابھی تک یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ محض تصور ہے یا حقیقت سے بھی اس کا کوئی تعلق ہے ــــ ؟ یہی سوچ کر وہ بیٹوں سے بولی۔

"تم دونوں ہوش کی دوا کرو ــــ کیا تم پاگل ہو گئے ہو ــــ ؟ یہ تو آئینوں میں محض عکس ہے ــــ حقیقت سے عکس کا کیا تعلق ــــ ؟ کیا کبھی کسی شخص نے عکس سے بھی شادی کی ہے ــــ ؟"

ماں کے اس جواب پر بڑے بیٹے نے قدرے ناراض اور اداس ہو کر سر کو جھٹکا دیا اور چھوٹا بے چینی میں ماتھے پر شکنیں ڈال کر رہ گیا ــــ ماں کی اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس طرح بات آئی گئی ہو کر رہ گئی۔

اس بات کو کئی روز گزر گئے لیکن بڑھیا کے دونوں بیٹوں کے ذہن سے آئینوں میں نظر آنے والی لڑکیاں محو نہ ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر اداس تھے ــــ ان کا جی کسی کام کاج میں نہ لگتا تھا ــــ دن رات، اٹھتے بیٹھتے ان لڑکیوں کے بارے میں سوچتے رہتے ــــ ان کی بوڑھی ماں یہ سب کچھ جانتی تھی۔ اس نے اپنی طرف سے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح وہ لڑکیوں کا خیال دل سے نکال دیں مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی ــــ جب اس نے یہ محسوس کیا کہ بیٹوں کا خیال بدلنا مشکل ہے تو اس نے فیصلہ کیا کہ بہتری اسی میں ہے بیٹوں کو وہ آخری بات بھی بتا دوں جو بزرگ نے بتائی تھی۔ دراصل وہ اپنے بیٹوں کو اس طرح اداس اور غمگین بھی نہیں دیکھ سکتی تھی ــــ چنانچہ ایک روز اس نے دونوں بیٹوں کو پاس بلایا اور کہا۔

"دیکھو بیٹو ـــــ ! مجھ سے تم دونوں کی اداسی اور پریشانی نہیں دیکھی جاتی اس لیے آج میں تمھیں وہ راز بھی بتائے دیتی ہوں جو مجھے اس بزرگ نے بتایا تھا۔ اس راز کو جاننے کے بعد تم ان لڑکیوں تک پہنچ سکو گے۔"

وہ اتنا کہہ کر لمحہ بھر کے لیے رُکی اور پھر کہنا شروع کیا۔

"مجھے اس بزرگ نے بتایا تھا کہ اگر ہر سال کے تیسرے چاند کے تیسرے روز ٹھیک آدھی رات کے وقت ان آئینوں کا رُخ جنوب مغرب کی سمت کر دیا جائے تو ان میں ایک ایسی روشنی دکھائی دے گی جو ان لڑکیوں تک پہنچنے کے لیے رہنمائی کرے گی ـــــ بس مجھے اس نے صرف اتنا ہی بتایا تھا۔"

بڑھیا کا اتنا کہنا تھا کہ دونوں لڑکے خوشی میں ماں سے لپٹ گئے۔

"ماں ـــ ! تم کتنی اچھی ہو ـــــ اب ہم ان لڑکیوں کو ضرور حاصل کر لیں گے۔"

اس کے بعد دونوں بھائی بڑی بے چینی اور بے تابی سے نئے سال کے تیسرے چاند کے تیسرے دن کا انتظار کرنے لگے۔ اتفاق کی بات تھی کہ تیسرا چاند بھی قریب ہی تھا۔ لہٰذا جب تیسرے چاند کا تیسرا دن آیا تو بڑھیا نے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بُلا کر کہا۔

"بیٹو ـــــ ! تم جانتے ہو میں بوڑھی ہو گئی ہوں ـــــ اس وقت مجھے تمھارے سہارے کی شدید ضرورت ہے۔"

اس کے بعد وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"میں تمھیں جانے کی اجازت تو دے رہی ہوں مگر تم دونوں ایک ساتھ نہیں جا سکتے۔ اگر تم دونوں چلے گئے تو میں اس بڑھاپے میں تنہا رہ جاؤں گی ـــ کون جانتا ہے پیچھے کیا ہو ـــــ ؟ میں بوڑھی ہوں میرا سہارا کون بنے گا ـــ ؟ اس لیے پہلے تم میں سے کوئی ایک جائے اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو پھر دوسرا جائے۔"

یہ بات سنتے ہی چھوٹا بیٹا جلدی سے کہنے لگا۔

"ہاں ——! پہلے مجھے جانے کی اجازت دو —— ؟"

"نہیں —— تم مجھ سے چھوٹے ہو —— پہلے مجھے جانا چاہیے —— ؟"

بڑے بھائی نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا —— اس پہ ماں نے بھی اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا

"ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو —— پہلے بڑے بھائی کا حق ہے —— اسے پہلے جانا چاہیے "

پھر وہ چھوٹے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"تم ابھی چھوٹے ہو —— تم میرے پاس رہو اور پہلے اپنے بڑے بھائی کو جانے دو —— ؟"

چھوٹا بھائی اپنی ماں اور بھائی کے کہنے پر راضی ہو گیا —— دونوں میں یہ طے پایا کہ پہلے بڑا بھائی اپنی پسند کی لڑکی کو تلاش کر کے لائے اور اس کے بعد چھوٹا جائے —— اس طرح دونوں اپنی اپنی پسند کی لڑکیوں سے شادی کر لیں۔

یہ تیسرے چاند کی تیسری تاریخ تھی —— جوں ہی آدھی رات کا وقت ہوا، بڑا بھائی خاموشی سے اٹھا اور اپنے صحن میں آ گیا۔ اس نے اپنا آئینہ نکالا اور اس کا رُخ جنوب مغرب کی طرف کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس جانب جو دھندلائے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ تھا، اس میں سے ایک تیز اور چوندھیا دینے والی روشنی کا دھارا چھوٹا۔ اس روشنی میں اسے وہاں ایسی خطرناک چٹانیں اور گھاٹیاں نظر آ رہی تھیں جنھیں دیکھ کر ہی دل دہل رہا تھا —— پھر یہ روشنی ان پہاڑوں میں سے ہوتی ہوئی دوسرے سرے تک پہنچ گئی —— اس کے بعد ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح پھیل گئی کہ ایک روشن راستہ بن گیا —— اسے یہ راستہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا جو پہاڑوں میں سے گزرتا

ہوا اس پار تک چلا گیا تھا — جوں ہی لڑکے نے یہ سب کچھ دیکھا، وہ خوشی میں اچھل پڑا اور اس نے اسی لمحے سفر پہ چلنے کی تیاری شروع کر دی — وہ اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"ماں — مجھے خوشی خوشی رخصت کرو — اور اس روز کا انتظار کرو جب میں تمھاری خوب صورت بہو لے کر واپس آؤں گا —؟"

پھر اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا۔

"تم فکر نہ کرنا — میں بہت جلد لوٹ آؤں گا — اور پھر تم اپنی پسند کی بیوی کو لینے کے لیے چلے جانا۔"

ماں نے بیٹے کو گلے لگایا، بھائی نے پیار کیا، دونوں نے اسے بہت سی دُعائیں دیں — اور اس طرح بڑھیا کا بڑا بیٹا گھر سے رخصت ہو کر اپنے سفر پر چل دیا۔

وہ گھر سے رخصت ہو کر آئینے کی رہنمائی میں اپنے سفر پہ چلتا رہا — بغیر ستائے آگے بڑھتا رہا — ابھی رات ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس راستے کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا جو آئینے کی مدد سے روشنی میں دکھائی دے رہا تھا اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو اپنے آپ کو ایک بہت بڑے پہاڑ کے نیچے پایا۔ اس نے دیکھا، اس کے چاروں جانب خوف ناک پہاڑ تھے، دُور دُور تک ہو کا عالم تھا اور وہ ایک بہت بڑے پہاڑ کے دامن میں کھڑا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے وہاں رُکا اور پھر اپنے سفر کو جاری رکھا — یہاں تک کہ ایک اور پہاڑ کی بہت بڑی چٹان کے پاس پہنچ گیا۔ اس چٹان کے نیچے ایک غار تھا جس کے مُنہ پہ ایک بہت بڑا پتھّر رکھا ہوا تھا۔ یہ پتھّر اس قدر چمک دار تھا کہ اس میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر اردگرد پھیل رہی تھی۔ وہ وہاں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کیونکہ اسے آئینے میں جو روشن راستہ دکھائی دیا تھا، وہ یہاں آکر ختم ہو گیا تھا — اب اس کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ آگے کس طرف کو اور کہاں

جائے ——؟ وہ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا سوچتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس غار کی جانب بڑھا کہ دیکھوں اس میں کیا ہے ——؟ اس پتھر سے اس قدر روشنی پھوٹنے میں کیا راز ہے ——؟ یہی کچھ معلوم کرنے کے لیے وہ دبے پاؤں غار کی جانب بڑھنے لگا۔ جب غار کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا، وہاں ایک بوڑھا بزرگ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے لمبے لمبے بال برف کی طرح سفید تھے اور اس کے چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں جنھوں نے چاروں طرف اجالا کر رکھا تھا —— بزرگ کو دیکھتے ہی اسے اپنی ماں کی بات یاد آگئی۔ جس بزرگ نے اس کی ماں کو آئینے دیئے تھے، ماں نے اس کا حلیہ بھی ایسا ہی بتایا تھا۔ اس نے اپنے دل ہی دل میں سوچا —— یقیناً یہی وہ خدا رسیدہ بزرگ ہے جس نے میری ماں کو آئینے دیئے تھے ——! پھر جب وہ ہولے ہولے اس بزرگ کے قریب پہنچا تو اسے واقعی اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہی وہ نیک سیرت بزرگ ہے —— چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر بڑے ادب سے جھک کر عرض کیا۔

"اے نیک سیرت بزرگ —— میرا سلام قبول ہو ——؟"

جواب میں بزرگ نے بڑی آہستگی سے سر اٹھایا، مسکرا کے دیکھا اور دعا دی

"جیتے رہو بیٹا —— تم بہت اچھے لڑکے ہو!"

اس کے جواب سے نوجوان کو تسلی ہوئی —— اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"میں آپ کے ارشاد کے مطابق آئینے کی رہنمائی میں راستے کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا ہوں —— اب مجھے بتائیے، مجھے آگے کس طرف کو جانا ہے تاکہ میں اپنی پسند کی لڑکی تک پہنچ سکوں ——؟"

بزرگ نے بڑے سکون سے اس کی بات سنی اور پھر بڑی میٹھی آواز میں بولا۔

"آخر تم یہاں تک آہی گئے ——؟"

اتنا کہہ کر اس نے ایک نظر نوجوان پر ڈالی اور کہا۔

"بیٹا! اگلے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کر لو ــــ تمھارا آنے والا سفر بڑے خطروں والا ہے ــــ تمھیں طرح طرح کی مصیبتوں اور بلاؤں کا مقابلہ کرنا پڑے گا اس لیے ابھی سے پوری طرح سوچ سمجھ لو ــــ؟"

نوجوان نے اسی عاجزی سے عرض کیا۔

"آپ اطمینان رکھیں، میں حوصلہ نہیں ہاروں گا ــــ اگر آپ کی دعائیں اسی طرح میرے ساتھ رہیں تو ایک روز میں اس لڑکی کو ضرور اپنے ساتھ لے کر آؤں گا"

"اچھا، تو میرے قریب آؤ ــــ؟"

بزرگ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اور قریب آنے کے لیے کہا اور پھر بولا

"جس لڑکی کی تم تلاش میں نکلے ہو وہ مغرب کی طرف ایک بہت بڑے پہاڑ کے دامن میں رہتی ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے تمھیں وہ پہاڑ عبور کرنا پڑے گا جہاں شیروں کا بسیرا ہے ــــ اس کے بعد وہ دریا بھی پار کرنا پڑے گا جس پر دیوؤں کا قبضہ ہے اور جہاں کسی آدم زاد کا گزر نہیں ہو سکتا"۔

اتنی بات بتانے کے بعد بزرگ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور نوجوان کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"جس لڑکی کی تمھیں تلاش ہے وہ ایک دیونی کے قبضے میں ہے ــــ اس دیونی نے اس لڑکی کو ایک سرخ پودے کے روپ میں تبدیل کر کے اپنے مکان کے پچھواڑے والے باغ میں قید کر رکھا ہے"۔

بزرگ کی یہ بات سن کر نوجوان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ہمت جواب دے رہی ہو ــــ اسے شیروں میں سے گزرنا تھا، خوف ناک دیوؤں سے بچ کر نکلنا تھا، خطرناک پہاڑ اور دریا عبور کرنے تھے ــــ اور یہ بات اسے ناممکن سی معلوم ہو رہی تھی ــــ وہ خاموش کھڑا انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ بزرگ نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ کر لیا۔ اس نے کہا۔

"تمھیں اس باغ میں پہنچنا ہو گا ــــ جب تم اس باغ میں پہنچ جاؤ تو اپنا آئینہ اس

سُرخ پودے کی جانب کر دینا —— جوں ہی تم ایسا کرو گے، اس کے ساتھ ہی لڑکی دوبارہ انسانی روپ میں آجائے گی۔"

یہ کہہ کر بزرگ نے ایک بار پھر بڑے غور سے نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اب اس بات کا فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے کہ تمھیں اس سفر پہ جانا چاہیے یا نہیں —؟ تم ان مشکلات کا مقابلہ کر سکتے ہو یا نہیں —؟ اس لیے اب بھی موقع ہے پوری طرح سوچ لو ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا —؟"

یہ بات تو نوجوان بھی بخوبی سمجھ رہا تھا کہ جس سفر پہ جا رہا ہے، وہ بہت مشکل ہے — اس میں قدم قدم پہ جان کا خطرہ ہے لیکن وہ اپنے ارادے کا پکّا اور اپنی دُھن کا سچّا تھا۔ اس نے بڑے ادب سے بزرگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بابا جی —— یہ ٹھیک ہے کہ میرا سفر بہت خطرناک ہے مگر اب میں خالی ہاتھ واپس کیسے جا سکتا ہوں ——؟ پھر جب کہ میں یہاں تک آ ہی چکا ہوں تو مجھے آگے ضرور جانا چاہیے!"

"اگر تم میں اتنی ہمّت اور جرأت ہے تو ضرور جاؤ — مجھے تمھاری مدد کر کے خوشی ہوگی"

اس بزرگ نے یہ جملہ بڑی ہمدردی اور شفقت سے کہا —— اس کے بعد اس نے چند لمحے خاموشی اختیار کی اور پھر بولا۔

"لو، یہ ایک کوڑا ہے اور ایک دھاگے کا گولا —— میں تمھیں یہ بھی بتاتا ہوں کہ انھیں کیسے استعمال کیا جائے مگر اس سے پہلے تم یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لو کہ اگر ان کو استعمال کرتے وقت تم نے ذرا سی بھی غفلت برتی یا گھبراہٹ کا اظہار کیا تو نقصان اُٹھاؤ گے۔"

بزرگ نے نوجوان کو ایک کوڑا اور ایک سفید دھاگے کا گولا دیا — پھر اس نے کوڑے اور دھاگے کا استعمال بتایا کہ مصیبت کے وقت یہ کیسے کام میں لائے جائیں —— یہ سب کچھ بتانے کے بعد اس نے ایک راستے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اب تمھیں اس راستے پر جانا ہے — اسی جانب تمھاری منزل ہے۔"

بزرگ نے اتنا کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا — نوجوان نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور جب بزرگ کہیں نظر نہ آیا تو اس نے آگے چلنے کا فیصلہ کر لیا — اس نے دھاگے کا گولا اور کوڑا سنبھالا اور اللہ کا نام لے کر اگلے سفر پہ چل دیا۔

وہ اس نیک سیرت، بزرگ کی ہدایت کے مطابق ٹیڑھے ترچھے راستے پر چلتا ہوا ایک پہاڑ پہ چڑھ گیا۔ جب پہاڑ کی چوٹی پہ پہنچ گیا تو اس نے وہاں کھڑے ہو کر اپنی مخالف سمت میں دیکھا جہاں خوف ناک اور دشوار گزار چٹانیں دکھائی دے رہی تھیں — اسے یہ چٹانیں آہستہ آہستہ گہری اور سیاہ دُھند کے پردے میں سے باہر نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں — وہ چند لمحوں تک وہاں حیران اور خاموش کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا — پھر اس نے اس جانب نظر ڈالی جدھر اسے جانا تھا — بزرگ نے اسی راستے پر جانے کی ہدایت کی تھی لہٰذا اس نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا توں توں راستہ تنگ سے تنگ تر اور خطرناک سے خطرناک تر ہوتا چلا جا رہا تھا — ایک تو راستہ دشوار تھا اور اوپر سے وہ بعض جگہوں پہ اس قدر تنگ تھا کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زمین کی بجائے ہوا میں لٹکا ہوا چل رہا ہے تاہم وہ ان تمام مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جوں توں کر کے آگے بڑھتا جا رہا تھا — ایک جگہ جوں ہی وہ آگے بڑھنے لگا، اس کے پاؤں وہیں کے وہیں جم کر رہ گئے۔ وہ خوف اور دہشت کے مارے پسینے میں شرابور ہو گیا — اس نے دیکھا، بڑے بڑے قد کے دو خونخوار شیر دھاڑتے ہوئے اس کی طرف لپک رہے تھے — نوجوان نے بجلی کی سی تیزی سے بزرگ کا دیا ہوا کوڑا مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جوں ہی شیر منہ پھاڑے ہوئے اس پہ جھپٹنے لگے، نوجوان نے پلک جھپکتے میں اپنا کوڑا دوبارہ فضا میں لہرایا — اور جیسا کہ بزرگ نے اسے بتایا تھا، اس کے ساتھ ہی وہ بلند آواز میں بولا۔

"اے پہاڑ کے محافظ شیرو، مجھ سے دور ہو جاؤ — میں یہاں اپنی

ایک پیاری چیز لینے آیا ہوں ۔"

اس کا اتنا کہنا تھا کہ اس کے ساتھ ہی دونوں شیر وہیں رُک گئے جہاں وہ کھڑے تھے ۔۔ انھوں نے اپنے پھاڑے ہوئے جبڑے بند کر لیے ، اپنے سروں کو جھکا لیا اور خاموشی سے اُلٹے پاؤں لوٹ گئے ۔۔ شیروں کے چلے جانے کے بعد نوجوان نے پھر آگے چلنا شروع کر دیا ۔ وہ چلتے چلتے پہاڑ کی ایک اور چوٹی پر پہنچ گیا ۔ دم بھر کو چوٹی پر رُک گیا اور وہاں کھڑے کھڑے چاروں طرف نظریں دوڑائیں ۔۔ وہاں سے آگے ، نیچے کی جانب ایک بہت بڑے پاٹ کا دریا تھا ۔۔ اس دریا کے ارد گرد نہ کوئی چٹان تھی اور نہ ہی وہاں کوئی درخت اُگا ہوا تھا ۔۔ وہ پہاڑ سے اُترتا ہوا دریا کی طرف چل دیا اور تھوڑی ہی دیر میں دریا کے کنارے پہنچ گیا ۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے دھاگے کا وہ گولا نکالا جو اسے نورانی بزرگ نے دیا تھا ۔ اس نے دھاگہ کھول کر دریا کے پانی میں پھینکا اور زور سے پکارا ۔

"اے دیوؤ سنو ! میں یہاں اپنی ایک پیاری چیز کو لینے آیا ہوں ۔۔ جلدی کرو پانی سے باہر آؤ اور اس پانی پر میرے لیے ایک پُل بنا دو ۔۔۔ !"

جوں ہی اس نے یہ بات کہی ، یکایک دریا میں سے سبز رنگ کا پانی بڑی تیزی سے اُبل اُبل کر اوپر آنے لگا ۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی پانی کی بلائیں اور دیو باہر آنے لگے ۔ ان دیوؤں اور جنوں کی شکلیں اتنی عجیب و غریب تھیں کہ نوجوان نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں ۔ بعض کی دُمیں مچھلیوں جیسی تھیں اور دھڑ انسانوں کی طرح تھے بعض کے سر انسانوں جیسے اور جسم کچھوؤں جیسے تھے ۔ انھیں دیکھ کر ہی انسان کو ہول آنے لگتا تھا ۔۔۔ انھوں نے پانی کی سطح پر آتے ہی دھاگے کو پکڑا اور اس کا ایک سرا دریا کے دوسرے کنارے تک لے گئے ۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دریا پر تنگ راستے والا ایک لکڑی کا پُل تیار تھا ۔ نوجوان نے جب دیکھا کہ پُل تیار ہو چکا ہے تو اس نے کوڑے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور پُل پر سے دریا پار کرنے لگا ۔ راستہ بہت ہی چھوٹا تھا اس لیے وہ آہستہ آہستہ پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا ۔ جب وہ

دریا کے عین درمیان میں پہنچا تو اس نے بے دھیانی میں یوں ہی نیچے دریا کی طرف دیکھا۔ نیچے پانی میں بے شمار بلائیں اور دیو گھوم رہے تھے جن کی بڑی بڑی انگارہ سی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں ـــــ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر وہ قدرے گھبرا سا گیا ـــــ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر پُل پر سے میرا پاؤں پھسل جائے اور میں پانی میں ان بلاؤں کے درمیان گر پڑوں تو میرا کیا حشر ہو ـــــ؟ اتنی بات سوچتے ہی وہ اور زیادہ گھبرا گیا ـــــ اس کی دونوں ٹانگیں کانپنے لگیں اور سر چکرانے لگا ـــــ اس گھبراہٹ اور پریشانی میں وہ بزرگ کی یہ نصیحت بھی بھول گیا کہ اس کی دی ہوئی چیزوں کو استعمال کرتے وقت اوسان قائم رکھنا ضروری ہے ـــــ جوں ہی وہ اس گھبراہٹ میں مبتلا ہوا، دریا پہ بنا ہوا پُل آہستہ آہستہ چھوٹا اور تنگ ہونا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ چند ہی لمحوں میں وہ اس دھاگے میں تبدیل ہو گیا جو نوجوان نے دریا میں پھینکا تھا۔ پُل کا دھاگے میں تبدیل ہونا تھا کہ نوجوان دریا میں جا گرا ـــــ اور پھر ـــــ چند ہی لمحوں بعد، وہاں نہ پانی کی بلائیں تھیں، نہ پُل اور نہ نوجوان ـــــ آناً فاناً میں یہ سب کچھ دریا کے پانی میں غائب ہو چکا تھا۔

اس واقعے کو پورا ایک سال ہو چکا تھا۔ بوڑھی ماں ابھی تک اپنے بڑے بیٹے کی منتظر تھی ـــــ اس کے دل میں ابھی تک اس کی واپسی کی اُمید جاگ رہی تھی۔ اسے ابھی تک اس بات پہ یقین نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی بُرا حادثہ پیش آیا ہو گا اور وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو گا۔ وہ دن رات اس کی واپسی کی دُعائیں مانگتی اور روز بروز اداس ہوتی جا رہی تھی۔ اسی طرح ایک سال کا عرصہ بیت چکا تھا اور ایک بار پھر وہی سال کا تیسرا چاند اور چاند کی تیسری تاریخ آ گئی تھی ـــــ یہ رات بوڑھی ماں اور اس کے چھوٹے بیٹے کے لیے اور بھی اداس کُن تھی کیوں کہ ایک سال پہلے اسی رات کو بڑا بیٹا اپنی مہم پہ روانہ ہوا تھا۔ چھوٹے بیٹے نے جب یہ دیکھا کہ آج

پھر وہی رات ہے تو اس نے قدرے جھجک کے ساتھ اپنی ماں سے کہا۔

" ماں — ! گزشتہ سال چاند کی یہی تیسری تاریخ تھی جب بڑا بھائی ہم سے جُدا ہوا تھا — !"

" ہاں بیٹا — ! یہی رات تھی !"

ماں نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا۔

" خدا جانے وہ اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے — ؟"

وہ دونوں تھوڑی دیر تک اسی طرح آپس میں باتیں کرتے رہے اور پھر چھوٹے بیٹے نے منت کے لہجے میں کہا۔

" ماں — آج مجھے بھی اجازت دو تاکہ میں اپنی پسند کی لڑکی کو تلاش کر کے لاؤں — ؟"

" کیا کہا — ؟"

اس کی بوڑھی ماں جیسے چونک سی پڑی — اس نے پریشان ہو کر کہا۔

" تم جانتے ہو کہ ابھی تک تمہارا بھائی پلٹ کر نہیں آیا — پھر تم مجھے اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو — ؟"

اس پر چھوٹے بیٹے نے ماں کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

" ماں — ! میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ضرور واپس آجاؤں گا — ؟"

اس کے بعد وہ اپنی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

" اس طرح میں اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کو بھی تلاش کر لوں گا۔"

اس کی یہ بات بوڑھی ماں کے لیے اُمید کی ایک کرن کی طرح تھی — وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح بڑا بیٹا گھر واپس آجائے اور اس کی اب ایک یہی صورت تھی کہ کوئی اسے تلاش کر کے لائے — اگر اسے خود بخود آنا ہوتا تو اب تک کب کا آچکا ہوتا — اسے یہ بھی دھڑکا تھا کہ خدا نہ کرے، کہیں وہ کسی مصیبت

میں گرفتار ہو گیا ہو۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کن حالات سے دوچار ہے۔ لہٰذا وہ اس بات پر راضی ہو گئی کہ چھوٹا بیٹا جائے اور اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کو بھی تلاش کر کے لائے ــــ اس نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

" ایک بات یاد رکھنا ــــ تم اپنی پسند کی لڑکی تلاش کر سکو یا نہ کر سکو مگر گھر واپس ضرور آ جانا ــــ اور یہ نہ بھولنا کہ تمہیں اپنے بڑے بھائی کو بھی تلاش کرنا ہے ــــ!"

چھوٹے بیٹے نے جواب میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

" ماں ــــ! تم بے فکر رہو ــــ مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ میں دونوں کو تلاش کر کے اپنے ساتھ لے آؤں گا۔"

جوں ہی آدھی رات کا وقت ہوا، چھوٹا بیٹا اپنے مکان کے کھلے صحن میں آ گیا ــــ اس نے جیب میں سے آئینہ نکال کر اس کا رُخ جنوب مغرب کی طرف کیا ــــ اور پھر اس نے دیکھا، ایک تیز روشنی کا دھارا دُور تک چلا گیا تھا جو آگے چل کر ایک چمک دار اور روشن راستہ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے خوشی میں اپنی ماں کو گلے لگا لیا اور کہنے لگا۔

" ماں ــــ! اب مجھے اجازت دو تاکہ میں اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں ــــ؟"

ماں نے اسے بہت سا پیار کیا، دُعائیں دیں اور وہ ماں کو خدا حافظ کہہ کر اس سمت کو چل دیا جدھر تیز روشنی نے اسے راستہ دکھایا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلا تو آدھی رات کا وقت تھا۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنی منزل کی جانب سفر جاری رکھا۔ اس طرح رات بھر چلتا رہا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا، کدھر جا رہا ہے مگر اس کے دل میں اس بات کا یقین تھا کہ آئینے کی روشنی اس کی رہنما ہے اور اس نہ رنگ کا کہا سچ ثابت ہو گا۔ اس نے دل میں کسی قسم کا وسوسہ لائے بغیر اپنا سفر جاری رکھا ــــ یہاں تک کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے

وہ وہاں پہنچ گیا جہاں پہاڑ کے دامن میں روشنی کا راستہ ختم ہو گیا تھا ـــــ وہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گیا اور سوچنے لگا کہ۔

"اب کدھر کا رُخ کروں ـــ؟ میری منزل کدھر ہے ـــ؟"

اتنے میں اس نے دیکھا تو اسے وہی نورانی چہرے والا بزرگ نظر آیا جو اس سے پہلے اس کے بھائی کو ملا تھا۔ اس فرشتہ صورت بزرگ کے چہرے کے اردگرد نور کا ایک ہالا سا بنا ہوا تھا اور اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل رہی تھی ـــ اس بزرگ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا ـــ یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی کے انتظار میں بیٹھا تھا ـــ اس نے اشارے سے نوجوان کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"آخر تم بھی یہاں تک آ ہی گئے ـــ؟!"

پھر اس نے بڑے بھائی کی طرح اسے بھی ایک کوڑا اور دھاگے کا ایک گولا دیا ـــ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے تاکید کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ۔

"اگر تم نے میری ہدایات پہ عمل نہ کیا تو پچھتاؤ گے۔"

اس کے بعد اس نے بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

"گزشتہ سال اسی رات تمھارا بڑا بھائی بھی یہاں آیا تھا۔ وہ بھی اسی مہم پہ گیا تھا مگر اس نے میری ہدایات پہ پوری طرح عمل نہ کیا اس لیے وہ پہاڑ کے دامن میں بہنے والے دریا میں گر پڑا ـــ یہ دریا بہت خطرناک ہے اور اس پہ دیوؤں اور بلاؤں کا قبضہ ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے نوجوان کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

"تم جس سفر پہ جا رہے ہو وہ بہت کٹھن ہے۔ اس میں قدم قدم پہ جان کا خطرہ ہے ـــ اب یہ تم خود فیصلہ کرو کہ تمھیں یہ سفر اختیار کرنا چاہیے یا نہیں ـــ؟ پوری طرح سوچ سمجھ لو ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا ـــ؟"

نوجوان نے جب اپنے بھائی کے بارے میں سُنا تو وہ اداس ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے سامنے اپنے بھائی کا چہرہ گھوم گیا اور اس

نے اپنے دل میں سوچا ـــ اتنی خوف ناک بلاؤں ہی گھر کر میرا بھائی یقیناً موت کے مُنہ میں چلا گیا ہوگا ـــ ؟ یہ سوچ کر اس نے پکّا ارادہ کر لیا کہ اپنی مہم پر ضرور جائے گا خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے ۔ اس نے بزرگ سے عرض کیا ۔

"میں ضرور جاؤں گا ـــ چاہے مجھے کیسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑے میں اپنے سفر پہ ضرور جاؤں گا ۔"

بزرگ نے جب یہ دیکھا کہ وہ اپنے ارادے سے پھرنے والا نہیں تو اس نے ایک سمت کو اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

"یہ تمھارا راستہ ہے ـــ تمھیں اسی طرف جانا ہے ۔"

اس کے ساتھ ہی اس بزرگ نے اس کی کامیابی کی دعا کی ، خدا حافظ کہا اور غائب ہو گیا ـــ نوجوان نے اپنا کوڑا مضبوطی سے تھاما اور بزرگ کے بتائے ہوئے راستے پر چل دیا ـــ راستہ بڑا خطرناک تھا ۔ ہر طرف موت اس کے انتظار میں کھڑی تھی مگر وہ ہمت سے کام لے کر دشوار گزار گھاٹیوں اور ڈھلانوں سے گزرتا رہا ـــ یہاں تک کہ شیروں کے پہاڑ کو عبور کر کے وہاں پہنچ گیا جہاں پہاڑ کے دامن میں ایک بہت بڑا دریا تھا ـــ دریا کے کنارے پہنچ کر اس نے ایک نظر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر دھاگے کا گولا دریا میں پھینک کر بلند آواز میں بولا ۔

"اے پانی کی بلاؤ سُنو ! میں اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لیے یہاں تک آ گیا ہوں ـــ جلدی پانی سے باہر آؤ اور میرے لیے دریا پہ ایک پُل بنا دو ـــ ؟"

جوں ہی اس نے یہ کہا دریا میں سے ایک دم پانی اُبل اُبل کے اوپر آنے لگا ۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی بلائیں پانی سے باہر نکل آئیں ۔ انھوں نے اس کے پھینکے ہوئے دھاگے کو دریا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا دیا ـــ دیکھتے ہی دیکھتے دھاگہ دریا کے دونوں کناروں تک پھیل گیا اور پھر اس نے لکڑی کے ایک پُل کی صورت اختیار کر لی ۔ پُل بہت تنگ تھا ـــ مشکل ہی سے ایک آدمی اس پہ سے گزر سکتا تھا ۔ نوجوان نے جب دیکھا کہ پُل بن چکا ہے تو وہ بڑے حوصلے اور جرأت

سے آگے بڑھنے لگا۔ اس پر ذرا سی بھی گھبراہٹ طاری نہ ہوئی۔ اس کی ٹانگوں میں بڑا استقلال تھا۔ جب وہ پل پار کر رہا تھا تو اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کوڑے کو ادھر ادھر ہلاتا جاتا تھا۔ اس طرح اسے نیچے پانی پہ کوڑا مارنے کی ضرورت پیش نہ آئی کیوں کہ دیو یا بلائیں اس کے قریب نہ آسکتے تھے۔ اس طرح وہ بڑی آسانی سے پل پہ سے گزر کر دریا پار کر گیا۔

دریا پار کرنے کے بعد نوجوان آگے بڑھنے لگا۔ راستے میں دو بہت بڑے اور دشوار گزار پہاڑ آئے مگر وہ ہمت کر کے انھیں بھی عبور کر گیا۔ جب وہ پہاڑوں کے دوسری طرف پہنچا تو اسے وہاں صنوبر اور سرو کے درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ اس مکان کی طرف سے خوشبودار ہوا کی لہریں آرہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ اس مکان کے قریب چلا گیا — وہاں جاکر اس نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا اور مکان کا سامنا دروازہ کھٹکھٹانے کی بجائے اس کی پچھلی طرف چلا گیا۔ نورانی چہرے والے بزرگ نے اسے یہی ہدایت کی تھی۔ مکان کی پچھلی جانب ایک چھوٹا سا باغ تھا — یہ باغ ہرا بھرا تھا اور اس کے اردگرد دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس دیوار کے باہر بے شمار خوب صورت پھول کھلے ہوئے تھے جو اس کا دل اپنی طرف کھینچ رہے تھے مگر اس نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ دیوار کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا کوڑا لہرایا اور اس کے ساتھ ہی کوڑا رسّی کی سیڑھیوں میں تبدیل ہو گیا۔ نوجوان نے رسّی کی سیڑھی دیوار پہ پھینکی اور اس کی مدد سے دیوار پہ چڑھ گیا۔ اوپر چڑھنے کے بعد اس نے سیڑھی کو اپنی طرف کھینچا۔ جوں ہی سیڑھی اس نے اپنی طرف کھینچی وہ پھر کوڑے کی شکل میں بدل گئی اس نے کوڑا ہاتھ میں پکڑا اور دیوار پھلانگ کر باغ میں چلا گیا۔ اندر جاکر دیکھا تو وہاں ایک خوب صورت پودے پہ دو بڑے بڑے پھول جھوم رہے تھے۔ ان میں سے ایک پھول سُرخ تھا اور دوسرا سبز رنگ کا تھا۔ یہ دونوں پھول انتہائی حسین تھے اور ان میں سے خوشبو کے جھونکے آرہے تھے — نوجوان نے جلدی سے اپنی جیب میں سے آئینہ نکال کر سبز رنگ کے پھول کی طرف کر دیا اور بزرگ کی ہدایت

کے مطابق بلند آواز میں بولا۔

"اے سبز پھول —— !"

جوں ہی اس نے یہ جملہ کہا، اس نے دیکھا، پلک جھپکتے ہی وہ سبز پھول ایک نہایت حسین و جوان لڑکی کے روپ میں، اس کے سامنے تھا۔ لڑکی کا لباس سبز رنگ کا تھا اور یہ وہی لڑکی تھی جو اس نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اپنے آئینے میں دیکھی تھی۔ لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا دل خوشی میں دیوانہ سا ہو گیا۔ وہ بے تاب سا ہو کر بولا۔

"اے سبز پھول —— میں تمھیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں —— کیا تم میرے ساتھ چلوگی —؟"

جواب میں لڑکی نے گردن اُٹھا کر اسے ایک نظر دیکھا اور مسکرائی —— مگر پھر فوراً ہی اس کے چہرے سے ساری مسکراہٹ غائب ہو گئی —اس نے چہرہ گھما کر سُرخ پھول کی جانب نگاہ ڈالی اور اس کے ساتھ ہی اداسیوں میں ڈوب گئی۔ اس کے چہرے پر غم کے آثار ظاہر ہو گئے اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سُرخ پھول کو یہاں تنہا چھوڑ کر تمھارے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں؟"

پھر اس نے نوجوان کو بڑے پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

"اگرچہ اس طرح میں دیونی کے قبضے سے آزاد ہو جاؤں گی لیکن میں اس وقت تک کیسے خوش رہ سکتی ہوں جب تک میری بہن اس کی قید میں ہے —؟"

لڑکی نے اتنا کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر شبنم کی طرح قریب ہی کھلے ہوئے سُرخ پھول کی پتیوں پہ گرنے لگے۔ نوجوان نے لڑکی کو اس طرح روتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل بھی بھر آیا۔ اس نے سوچا، ہو نہ ہو یہ سُرخ پھول ہی اس کے بھائی کی پسندیدہ لڑکی ہے۔ مگر وہ اس وقت کیا کر سکتا تھا —؟ اس کے پاس اپنے بھائی کا آئینہ نہیں تھا اور جب تک وہ آئینہ نہ ہوتا وہ اسے کیسے انسانی روپ میں

لاتا ——؟ وہ کھڑا اسی اُلجھن میں گرفتار تھا کہ اتنے میں لڑکی جلدی سے بولی ۔

" جلدی کرو اور میرے ساتھ مکان کے اندر آجاؤ —— دیونی آنے ہی والی ہے ——! "

پیشتر اس کے کہ نوجوان اس سے کوئی سوال کرتا وہ اسے مکان کے اندر لے گئی اور کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ جوں ہی وہ مکان کے اندر گئے اس کے چند ہی لمحوں بعد دیونی بھی آگئی ۔ نوجوان نے دروازے کی درزوں میں سے جھانک کر دیکھا دیونی ایک لمبا سا جبّہ پہنے ہوئے تھی ۔ اس کے ہاتھوں اور چہرے کو لمبے لمبے بالوں نے چھپا رکھا تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے مکان کے برآمدے میں رُکی اور پھر لڑکی کو کوستے ہوئے بولی ۔

" اے سبز پھول —— ! لعنت ہو تم پہ ! "

اس کے بعد وہ قدرے چیخ کر کہنے لگی ۔

" تمھیں کس بدبخت نے دوبارہ انسانی روپ میں بدل دیا ہے ——؟ تم نے ایک اجنبی کو اپنے کمرے میں کیوں چھپا لیا ہے ——؟ "

اتنا کہہ کر اس نے زور سے دروازے کو دھکا دیا اور دروازہ ایک خوف ناک آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیونی کے جبّے میں سے دھوئیں اور گرد و غبار کا ایک طوفان سا اُٹھنے لگا۔ نوجوان اور لڑکی دونوں سہم گئے مگر نوجوان کے پاس بزرگ کا دیا ہوا آئینہ ہونے کی وجہ سے دیونی لڑکی کو دوبارہ پھول میں تبدیل نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی طوفان ان کے قریب تک جا سکتا تھا —— اب یہ بات اس کے بس سے باہر تھی ۔ دیونی نے جب یہ دیکھا کہ اب میرا جادو چلنا مشکل ہے تو اس نے دل میں سوچا، کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے ؛ لہٰذا اس نے دھوئیں اور گرد و غبار کا طوفان بند کر دیا ۔ اس کے ساتھ ہی اپنا رویّہ تبدیل کرتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں بولی ۔

" اے سبز پھول ! تم میری اچھی بچی ہو —— اگر نوجوان واقعی خوب صورت ہے تو مجھے منظور ہے ۔ میں تمھاری اس سے شادی کر دوں گی —— ؟ "

نوجوان اور لڑکی نے دیوی کی اس بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دونوں خاموش کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ دیوی پھر پیار بھرے لہجے میں لڑکی سے کہنے لگی۔

"تمھیں معلوم ہے، میرے پاس بہت سے گھوڑے، گائیں، خچریں، اور بھیڑیں ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آج رات کوئی آدمی انھیں چرانے کے لیے آرہا ہے اس لیے نوجوان کو اجازت دو تاکہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کرے — میں تم سے وعدہ کرتی ہوں، اگر آج رات واقعی اس نے میری مدد کی تو کل صبح میں تمھیں اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دوں گی —؟"

دیوی نے اتنی بات کہی اور وہاں سے چلی گئی — اس کے جانے کے بعد نوجوان نے حیرانی اور پریشانی میں لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

"اس کا ارادہ یہ ہے کہ کسی طرح تمھیں قتل کر دے — تمھارا آئینہ قبضے میں کرے اور مجھے پھر سے پھول میں تبدیل کر کے قید کر دے۔"

پھر اس نے نوجوان کو بتایا کہ۔

"اس کے پاس گھوڑے ہیں نہ گائیں، خچریں ہیں نہ بھیڑیں — یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ بہانے سے تمھیں لے جائے گی — پھر شیروں، چیتوں، اور بھیڑیوں کو اکٹھا کرے گی تاکہ تمھیں چیر پھاڑ کھائیں۔"

نوجوان اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"گھبراؤ نہیں — مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

پھر اس نے اسے بتایا۔

"میرے پاس یہ کوڑا ہے — جب تک یہ میرے پاس ہے کوئی جنگلی درندہ میرے قریب نہیں آسکتا۔"

نوجوان کی یہ بات سن کر لڑکی کا خوف قدرے کم ہوا تاہم اس نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت چالاک ہے ـــ اس سے ہر وقت ہوشیار رہنا !"

"تم فکر نہ کرو !"

نوجوان مکان سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے کوڑے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور کچھ فاصلے پر کھڑی دیوی کے پاس چلا گیا۔ دیوی اسے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اس کی چال کامیاب ہو رہی ہے۔ وہ نوجوان کو اپنے ساتھ لے کر پہاڑ کی جانب چل دی۔ یہ پہاڑ بڑا خطرناک تھا کیوں کہ یہاں قسم قسم کے جنگلی درندوں کے غول کے غول رہتے تھے۔ جوں ہی وہ پہاڑ کے پاس پہنچے دیوی نے نوجوان سے کہا۔

"یہیں کہیں میرے مویشی چر رہے ہیں ـــ تم ذرا ان کی نگرانی کرنا تاکہ انھیں کوئی لے نہ جائے"

اس نے اتنا کہا اور اچانک غائب ہو گئی ـــ نوجوان نے کھڑے کھڑے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہاں دُور دُور تک نہ کوئی گھوڑا دکھائی دیا، نہ کسی گائے کا پتہ چلا، نہ کوئی خچر وہاں تھی اور نہ کوئی بھیڑ بکری نظر آئی۔ وہ جس طرف بھی دیکھتا، اسے ہر طرف اونچی اونچی کانٹے دار جھاڑیاں دکھائی دیتیں جو بنجر زمین پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اس خیال سے وہاں کھڑا رہا کہ شاید کہیں سے مویشی چرتے چراتے ادھر آنکلیں۔ اس نے چند قدم ادھر ادھر گھوم کر بھی دیکھا لیکن اسے کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اسی انتظار میں شام ہو گئی اور ہر طرف اندھیرا پھیلنے لگا ـــ جوں ہی جنگل میں اندھیرا پھیلا، نوجوان نے دیکھا تو چاروں جانب جھاڑیوں میں سے خونخوار شیر، چیتے اور بھیڑیے نکلنے لگے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ارد گرد درندوں کے غول کے غول کھڑے تھے۔ ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ ان کے خوفناک منہ اس طرح کھلے ہوئے تھے جیسے وہ اسے ہڑپ کرنے کے لیے بے تاب ہوں ـــ تاہم ان میں سے کوئی ایک بھی نوجوان کے قریب آنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا کیوں کہ اس کے ہاتھ میں بزرگ کا دیا ہوا کوڑا تھا ـــ اسی طرح پوری رات گزر گئی۔ وہ کوڑا ہاتھ میں لیے چوکس کھڑا رہا اور درندے دُور ہی دُور سے اسے گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور صبح ہوتے ہی

تمام جنگلی درندے جھاڑیوں میں غائب ہوگئے ۔ یہ دیکھ کر نوجوان واپس دیوتی کے باغ میں آگیا۔ آگے دیوتی اپنے دل میں یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ رات کو درندوں نے اسے چیر پھاڑ کھایا ہوگا ، اب لڑکی کو اس سے کوئی چھڑا نہیں سکے گا لیکن جب اس نے نوجوان کو صحیح سلامت اپنے سامنے دیکھا تو بہت پریشان ہوئی ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ـــ ؟ اسے شیروں چیتوں نے کھایا کیوں نہیں ـــ ؟ بہر صورت اسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ اس کی یہ ترکیب بھی ناکام ہوگئی ہے ـــ اب کیا کرنا چاہیے ـــ ؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر فوراً ہی ایک اور ترکیب سوچ لی ـــ وہ بڑی مسکین بن کر نوجوان سے کہنے لگی ۔

" دراصل بات یہ ہے کہ مجھے سبز پھول سے بہت پیار ہے ـــ اگر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو اس کے غم میں میری موت واقع ہو جائے گی ـــ میں اس کے بغیر ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتی ۔"

اتنا کہنے کے ساتھ ہی وہ آنسو بہانے لگی اور جھوٹ موٹ روہانسی بن کر بولی ۔

" اگر تم اسے لے جانا ہی چاہتے ہو تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلو ـــ ؟"

جواب میں نوجوان کچھ کہنا چاہتا تھا کہ لڑکی نے اسے اشارے سے روک دیا کیونکہ وہ دیوتی کی چالوں سے اچھی طرح واقف تھی ۔ وہ اس کی اس نئی چال کو بھی بھانپ گئی تھی ـــ اسے معلوم تھا ، وہ اس طرح ہمارے ساتھ جا کر راستے میں کسی حیلے بہانے سے ہم دونوں کو ختم کر دے گی ـــ دیوتی تو اپنی جگہ چالاک تھی ہی لیکن لڑکی بھی اس سے کسی طرح کم نہ تھی ـــ اس نے دیوتی سے کہا ۔

" ہم تمھیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہیں ۔"

اس کا اتنا کہنا تھا کہ دیوتی خوش ہو کر بولی ۔

" میری اچھی بچی ـــ ! تم کتنی اچھی ہو !"

مگر ابھی لڑکی کی بات ختم نہیں ہوئی تھی ۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے

کہا۔

"تم بہت بوڑھی ہو اور ہمارا سفر طویل ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اپنے قد کا سائز تبدیل کر کے اتنا چھوٹا کر لو، جو اس جگ میں آجائے —— اس طرح ہم تمھیں اپنی کمر سے لٹکا کر آسانی سے لے جائیں گے۔ جگ میں تم آرام سے بھی رہو گی۔ چاہے سوتی رہنا چاہے بیٹھی رہنا —— تم سفر کی تھکاوٹ اور تکلیف سے بھی بچ جاؤ گی"۔

دیونی کو اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا —— اسے یقین تھا کہ وہ کسی بھی طرح ان کے ساتھ چلی جائے تو راستے میں کسی نہ کسی بہانے سے دونوں کا خاتمہ کر دے گی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں دیونی ہوں، اپنے جادو کے زور سے جب چاہوں گی پھر سے اپنی اصل شکل میں تبدیل ہو جاوں گی۔ لہٰذا وہ اس بات پہ راضی ہو گئی کہ اپنے قد کو چھوٹا کر کے جگ میں آجائے —— اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جلدی سے اپنے آپ کو چھوٹے سے چوہے میں تبدیل کر لیا۔ چوہے کی شکل میں تبدیل ہوتے ہی اس نے ایک چھلانگ لگائی اور اچھل کر جگ میں چلی گئی —— اس کا جگ میں داخل ہونا تھا کہ لڑکی نے بجلی کی سی تیزی سے جگ پہ ڈھکنا لگا دیا —— اس نے ڈھکنے کا پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا تھا۔ لڑکی نے ڈھکنے کو اچھی طرح کس دیا اور پھر نوجوان سے بولی۔

"اب جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل چلو ——!"

دونوں نے جلدی جلدی چلنے کی تیاری کی۔ جس جگ میں دیونی بند تھی اسے اٹھایا اور وہاں سے چل دیئے۔ گو ان کا سفر بڑا دشوار گزار اور طویل تھا مگر وہ دیونی کو اپنے قابو میں کرنے کے بعد اس قدر خوش تھے کہ جلد سے جلد اپنی منزل پہ پہنچ جانا چاہتے تھے —— وہ گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کرتے۔ چلتے چلاتے جب دیووں کے دریا کے کنارے پہنچے تو انھوں نے وہ جگ۔ جس میں دیونی بند تھی دریا میں پھینک دیا۔ اس کے بعد لڑکی دریا کے کنارے پہ بیٹھ گئی اور آنسو بھر بھر کے روتے ہوئے بولی۔

"اے چالاک دیونی لعنت ہو تم پہ!"

پھر وہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم نے مجھے اور میری بہن کو دُکھ پہنچانے کے لیے ہر وہ کام کیا جو تم کر سکتی تھیں۔ تم نے ہم دونوں کو اپنی تفریح کے لیے پھولوں میں تبدیل کر دیا اور اس طرح ہمیں اپنا قیدی بنا لیا۔"

اتنا کہہ کر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

"آہ! میری پیاری بہن ——! میں تمھیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں ——؟ میں تمھیں پھر انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

لڑکی دریا کے کنارے بیٹھی اپنی بہن کے غم میں ساون بھادوں کی طرح رو رہی تھی اسے اس طرح غمگین دیکھ کر نوجوان کا دل بھی بھر آیا —— اسے بھی اپنا بڑا بھائی یاد آ گیا تھا —— وہ بھی اپنے بھائی کو یاد کر کے لڑکی کے ساتھ سسکیاں بھرنے لگا —— اسی طرح وہ دونوں بیٹھے سسکیاں بھر رہے تھے کہ اچانک دریا میں ہل چل سی مچ گئی —— دریا میں سے زور کی لہریں اُٹھنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سبز پانی صاف و شفاف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی آسمان پر چھائے ہوئے سیاہ بادل بھی غائب ہو گئے —— انھوں نے دیکھا فضا میں ایک روشنی کا ہالا نمودار ہوا۔ اس ہالے میں وہی بزرگ دکھائی دے رہا تھا جس نے دونوں بھائیوں کو آئینے دیئے تھے اور انھیں راستہ بتایا تھا۔ روشنی کا یہ ہالا آہستہ آہستہ زمین پر اُتر آیا —— بزرگ نے مسکراتے ہوئے ایک نظر ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی چھڑی سے دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"اے پانی کی روحو سُنو! اس نوجوان کو فوراً کنارے پر لے آؤ جو گزشتہ سال اپنی محبوبہ کو لینے کے لیے یہاں آیا تھا ——؟"

بزرگ کا اتنا کہنا تھا کہ دریا کی تہہ میں سے ایک دیو اوپر آیا —— اس نے نوجوان کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھا رکھا تھا جو اس وقت بے ہوش تھا۔ چونکہ اس کے پاس بزرگ کا دیا ہوا آئینہ تھا اس لیے دیو اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لا سکے تھے —— دریا کی تہہ میں سے نکلنے والے دیو نے نوجوان کو کنارے پر لٹا دیا اور خود پھر پانی میں غائب ہو گیا —— نورانی چہرے والے بزرگ نے آگے بڑھ کر نوجوان کے سر پر ہاتھ پھیرا —— ہاتھ کا پھیرنا

تھا کہ وہ ہوش میں آگیا — بزرگ نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں —؟"

بڑے بھائی نے ہوش میں آنے کے بعد دونوں آنکھیں ملتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہو — وہ حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے —؟ وہ کہاں تھا، کہاں ہے اور اتنا عرصہ کیا ہوتا رہا —! پھر جب اس نے سامنے کھڑے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا تو اور بھی تعجب میں آگیا — نورانی چہرے والے بزرگ پہ نظر پڑی تو اور بھی سوچ میں پڑ گیا — اور جب ایک حسین لڑکی کو دیکھا تو خیالات میں اُلجھ کر رہ گیا — تاہم وہ اپنے بھائی کو دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور لپک کر اس سے لپٹ گیا — بزرگ نے انھیں اس طرح خوش دیکھا تو مسکراتے ہوئے دُعا دے کر بولا۔

"میرے بچو — خوش رہو — خدا تمھیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک نور کے ہالے میں فضا میں بلند ہونے لگا۔ یہاں تک کہ غائب ہوگیا۔

چھوٹے بھائی نے اسے اپنی ساری کہانی سُنائی کہ کس طرح وہ اور ماں ایک سال تک اس کا انتظار کرتے رہے، پھر وہ خود اس کی اور اپنی پسند کی لڑکی کی تلاش میں نکلا — کس طرح اسے نورانی چہرے والا بزرگ ملا اور کس طرح مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ دیونی کے باغ تک پہنچا۔ کس طرح اس نے لڑکی کو پھول سے انسانی روپ میں بدلا اور کس طرح وہ دیونی کو قبضے میں کرنے میں کامیاب ہوئے — یہ سب کچھ بتانے کے بعد اس نے اپنے بڑے بھائی کو لڑکی سے ملایا اور کہا۔

"یہ ہے میری پسند کی لڑکی جو میں نے آئینہ میں دیکھی تھی — اس کی بڑی بہن تمھاری پسند کی لڑکی ہے جو ابھی تک پھول کے روپ میں ہے — چوں کہ میرے پاس تمھارا آئینہ نہیں تھا اس لیے میں اسے انسانی روپ میں نہ لا سکا۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے بھائی سے کہا۔

"چلو — اب جلدی کرو — ہمیں ابھی واپس جاکر اسے اپنے ساتھ لانا ہے —؟"

چنانچہ وہ تینوں اسی وقت واپس دیونی کے باغ کی طرف چل دیئے. جب وہ وہاں پہنچ گئے تو بڑے بھائی نے اپنا آئینہ نکال کر سُرخ پھول کے سامنے کیا اور کہا۔

"اے سُرخ پھول —!"

اس نے اتنا کہا اور اس کے ساتھ ہی سُرخ لباس میں ملبوس ایک حسین و جمیل لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی اور پودے پہ سے سُرخ پھول غائب ہو چکا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس نے اپنے آئینے میں دیکھی تھی۔ دونوں بہنوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ایک عرصہ کے بعد انسانی روپ میں ایک دوسرے سے ملی تھیں۔ اور دونوں بھائی اس لیے خوش تھے کہ انھیں اپنی اپنی پسند کی لڑکی مل گئی تھی۔ جوں ہی چاروں ایک دوسرے سے ملے پہاڑوں پہ چھائے ہوئے سیاہ بادل خود بخود چھٹ گئے۔ اتنے میں چھوٹا بھائی بولا۔

"اب ہمیں جلدی گھر پہنچنا چاہیے — نہ جانے پیچھے ماں کا کیا حال ہوگا —؟"

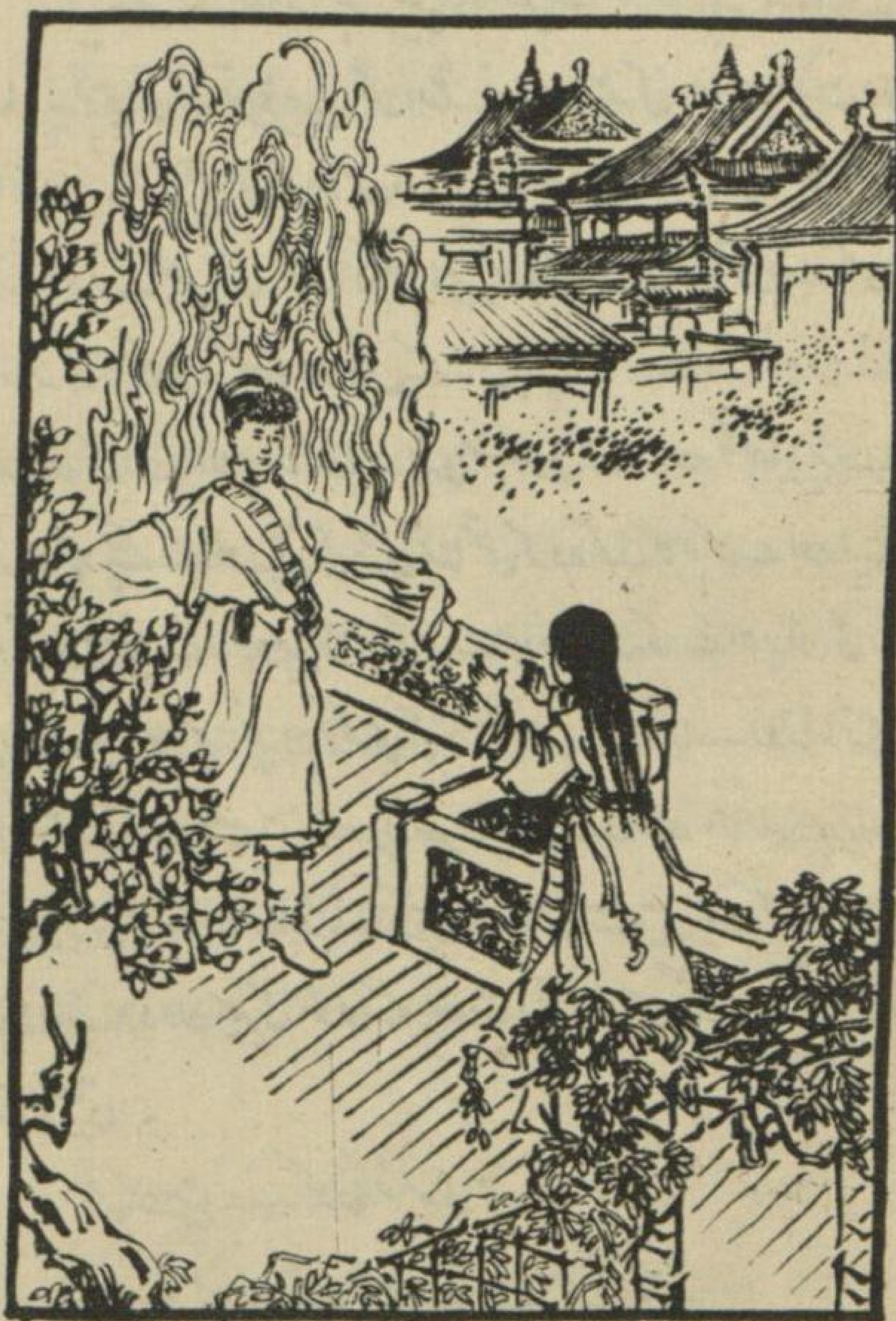
اور پھر — جب وہ دنوں کا سفر گھنٹوں میں اور گھنٹوں کا سفر پلوں میں طے کرتے ہوئے گھر پہنچے تو ان کی بوڑھی ماں انھیں دیکھ کر جیسے پھر سے زندہ ہو گئی — وہ تو ان کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چکی تھی اس لیے جب اس نے دونوں بیٹوں کے ساتھ ساتھ ان کی خوب صورت دلہنوں کو دیکھا تو خوشی سے دیوانی ہو گئی — اس نے بیٹوں کو گلے لگایا۔ اپنی بہوؤں کو پیار کیا ——— اور وہ سب ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

کہتے ہیں، وہ دن اور آج کا دن اکثر لوگ چودھویں رات کو بڑے پیار سے چاند کی طرف دیکھتے ہیں مگر کسی کو کوئی حسین لڑکی نظر نہیں آتی — شاید اس لیے کہ اب کسی کے پاس اس نورانی چہرے والے بزرگ کا دیا ہوا آئینہ نہیں ہے۔

ختم

شہزادی کا رومال

A FOLK TALE FROM CHINA



ایک دفعہ کا ذکر ہے، چین کے کسی علاقے میں چن نامی ایک نوجوان رہتا تھا۔ یہ نوجوان تھا تو غریب مگر اللہ نے اسے علم کی دولت بہت دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ جس قدر پڑھا لکھا تھا، اس سے کہیں زیادہ ذہین اور خوب صورت بھی تھا۔ اگر وہ کسی امیر گھرانے کا بیٹا ہوتا تو یقیناً کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا لیکن بد قسمتی سے اس کے ماں باپ مفلس تھے۔ انھوں نے بڑی مشقتوں کے دکھ اُٹھا کر اسے پالا پوسا تھا اور بڑی مشکلوں سے اسے لکھایا پڑھایا تھا۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور چن کی بڑی تمنا تھی کہ وہ کوئی کام کرے اور اپنے بوڑھے ماں باپ کو سُکھ پہنچائے۔ وہ چاہتا تھا کہ بہت سی دولت کمائے اور ان کی آخری زندگی سُکھ چین سے بسر ہو، چنانچہ وہ نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ روزانہ صبح ہی صبح گھر سے نکل کھڑا ہوتا اور قصبے میں اِدھر اُدھر ملازمت کے لیے مارا مارا پھرتا۔ جہاں بھی جاتا اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا اور جس سے اس سلسلے میں بات کرتا وہ انکار کر دیتا۔ اس طرح جب وہ دن بھر کی تکان کے بعد شام کو مایوس گھر لوٹتا تو اس کی ماں حسرت سے پوچھتی۔

"چن بیٹا — کوئی نوکری ملی —؟"

جواب میں وہ بجھے بجھے سے لہجے میں کہتا۔

"نہیں ماں ــــ اُمید ہے کل ضرور مل جائے گی !"

گو اسے روزانہ ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا تھا مگر بڑا باحوصلہ نوجوان تھا ــــ وہ ہمّت نہ ہارتا کیوں کہ اسے معلوم تھا، مایوسی اور ناکامی زیادہ دیر تک اس کا راستہ نہیں روک سکے گی ــ اس کی ماں بھی ہر بار اس کی ہمّت بندھاتی اور اسے تسلّی دیتے ہوئے کہتی ۔

"چلو، کبھی نہ کبھی تو نوکری مل ہی جائے گی ــــ تم کوشش کیے جاؤ !"

اسی طرح دن بیت رہے تھے ــــ چن ہر روز معمول کے مطابق صبح ہی صبح نئی امیدوں کے ساتھ گھر سے نکل جاتا اور اس کے بوڑھے ماں باپ ملازمت کی خوش خبری سُننے کے لیے اس کا انتظار کرنے لگتے ۔ آخر کئی روز کی مسلسل ناکامی کے بعد چن کی کوششیں کامیاب ہوگئیں ــ ایک شام وہ خوشی خوشی گھر آیا اور آتے ہی اپنی ماں سے کہنے لگا ۔

"ماں خوش خبری ــــ آج مجھے نوکری مل گئی ہے "۔

یہ سُن کر اس کی ماں بھی بہت خوش ہوئی اور اس کے باپ نے بھی خدا کا شکر ادا کیا ۔ اللہ نے ان کی سُن لی تھی ۔ چن کو ایک جرنیل کے پاس سیکرٹری کی حیثیت سے ملازمت مل گئی تھی ــ یہ جرنیل کھیلوں کا بڑا شوقین تھا ــ یوں تو اسے بہت سے کھیل پسند تھے لیکن کشتی رانی اور مچھلی کا شکار اس کا خاص مشغلہ تھا ــ مچھلی کے شکار اور سمندر کی سیر کا تو اسے بہت ہی شوق تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اسے اپنے ضروری کاموں سے تھوڑی بہت فرصت ملتی وہ اپنا یہ دل پسند شوق پورا کرتا ــ وہ اکثر و بیشتر شکار کے لیے جاتا اور جاتے وقت اپنے نوجوان سیکرٹری چن کو بھی ضرور اپنے ساتھ لے جاتا ۔ وہ چن کو بہت چاہتا تھا اس لیے سفر میں بھی اسے اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا ۔

ایک روز کی بات ہے ۔ جرنیل حسبِ معمول سمندر کی سیر کو گیا ۔ اس وقت چن بھی اس کے ہمراہ تھا ۔ ملاّح کشتی چلا رہے تھے اور وہ دونوں کشتی میں بیٹھے

سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے ۔ وہ بڑی دیر تک سیر کرتے رہے اور جب واپس لوٹنے لگے تو انھیں کشتی کے قریب ہی ایک ڈالفن مچھلی نظر آئی ۔ ڈالفن اپنے دھیان میں مست، موجوں سے کھیلتی ہوئی جا رہی تھی ۔ کبھی وہ پانی میں ڈبکی لگاتی اور کبھی اُچھل کر پانی کی سطح کے اوپر آ جاتی —— جوں ہی جرنیل کی نظر اس پہ پڑی، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جلدی سے اپنے کندھے سے اپنی کمان اُتاری، چلّے پہ تیر چڑھایا اور نشانہ تاک کر ایسا تیر مارا کہ سیدھا جا کر ڈالفن کے جسم میں پیوست ہو گیا —— تیر کا لگنا تھا کہ بے چاری ڈالفن بُری طرح تڑپنے لگی ۔ کشتی کھینے والے ملّاحوں نے جلدی سے جال ڈال کر ڈالفن کو کشتی میں کھینچ لیا —— اس طرح تھوڑی دیر پہلے موجوں سے کھیلنے والی مچھلی، اب کشتی میں پڑی تڑپ رہی تھی ۔ اسے دیکھ دیکھ کر جرنیل تو اس لیے خوش تھا کہ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا اور ملّاح اس لیے خوش تھے کہ انھوں نے اپنے مالک کی شکار کی ہوئی مچھلی کشتی میں کھینچ لی تھی ۔ اس کے برعکس جن کو بہت افسوس تھا —— اسے تڑپتی ہوئی ڈالفن پہ رحم آ رہا تھا ۔ اچانک سب نے دیکھا کہ اس ڈالفن کی دُم سے ایک چھوٹی سی مچھلی چپٹی ہوئی تھی ۔ اس چھوٹی مچھلی کو اس طرح چپٹے ہوئے دیکھ کر سب حیران تھے لیکن جن دل ہی دل میں کچھ سوچ رہا تھا ۔ اسے دونوں مچھلیوں کی بے بسی پہ ترس آ رہا تھا ۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے ڈالفن کے پہلو سے تیر نکالا ۔ اس کے بعد اس نے مچھلی کے زخم پہ مرہم اور پھاہا لگایا اور جرنیل سے درخواست کرتے ہوئے کہا ۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ان دونوں مچھلیوں کو دوبارہ سمندر میں چھوڑ دیں ؟"

"مگر وہ کیوں —— ؟"

جرنیل نے حیران ہو کر اس سے دریافت کیا ۔ اس پہ ملّاح بھی اپنے مالک کی خوشنودی کے لیے بولے ۔

"شکار کی ہوئی مچھلی کو دوبارہ سمندر میں پھینک دینا ہماری سمجھ میں نہیں آیا !"

چن نے ان کی بات سُنی اور ایک بار پھر اپنے مالک سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان مچھلیوں پر رحم آرہا ہے ——!"

اتنا کہہ کر اس نے اپنے مالک کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ان کو چھوڑ دینے سے آپ کا کوئی نقصان نہیں ہو گا ——!"

جرنیل چن کو بہت چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چن بہت نیک اور دیانت دار نوجوان ہے اس لیے وہ اکثر اس کا مشورہ مان لیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی جب چن نے مچھلیوں کو دوبارہ سمندر میں پھینک دینے کی درخواست کی تو اس نے کچھ زیادہ تردد نہیں کیا۔ پہلے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور اس کے بعد خوشی خوشی چن کی درخواست مان لی۔ وہ دل ہی دل میں اس کی رحم دلی سے خوش تھا چنانچہ جرنیل کے حکم سے ملاحوں نے اس ڈالفن کو پھر سے سمندر میں پھینک دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ مچھلی ایک بار پھر پانی کی آزاد موجوں سے کھیل رہی تھی۔

اس واقعے کو ایک سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ایک روز چن ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار بالکل اسی جگہ سے گزر رہا تھا جہاں ایک سال پہلے ڈالفن مچھلی زخمی ہوئی تھی اور پھر اس کی درخواست پر جرنیل نے اسے دوبارہ سمندر میں پھینک دیا تھا۔ آج چن اکیلا تھا اور جرنیل کے کسی کام سے واپس آرہا تھا۔ وہ اپنے دھیان میں کشتی کھیتا ہوا چلا آرہا تھا کہ اچانک ایک تیز و تند لہر اس کی کشتی سے ٹکرائی۔ لہر بہت بڑی اور تیز تھی اور چن کی کشتی اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی نظر آرہی تھی جوں ہی طوفانی لہر کشتی سے ٹکرائی، کشتی کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ چن نے بہت کوشش کی مگر وہ سنبھال نہ سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے کشتی اُلٹ گئی۔ کشتی کا اُلٹنا تھا کہ چن غوطے کھاتا ہوا سمندر میں جا گرا۔ کشتی نہ صرف اُلٹی تھی بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ خوش قسمتی سے کشتی کا ایک بڑا سا تختہ چن کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے اسے مضبوطی سے تھام لیا اور ڈوبنے سے بچ گیا۔ تاہم وہ اس وقت بے بس اور مجبور تھا۔ نہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکتا تھا اور نہ کوئی سہارا تھا۔ تختہ پانی کے

تھپیڑے کھاتا ہوا موجوں کے رُخ پر بہنے لگا اور چن اس تختے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تیرنے لگا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جارہا ہے، کدھر جارہا ہے اور اسے کس طرف جانا ہے ۔۔؟ اس نے اپنے آپ کو موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ۔۔ اب اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا ۔۔؟

دن ڈھلا، شام ہوئی اور پھر چاروں طرف رات کا اندھیرا پھیل گیا۔ اس اندھیرے میں چن تختے سے چمٹا ہوا تھا اور تختہ موجوں سے ٹکراتا، ڈولتا، اُبھرتا نہ جانے کہاں جارہا تھا۔ سمندر میں طرح طرح کی بلاؤں کا خطرہ تھا۔ ان کے تصور ہی سے چن کانپ کانپ جاتا ۔۔ موت اس کے چاروں طرف جال بچھائے ہوئے تھی مگر وہ اللہ پر بھروسہ کیے ہمت کا دامن تھامے تختے کے ساتھ تیرتا رہا ۔۔ یہاں تک کہ رات ختم ہوگئی۔ صبح کی روشنی ہوتے ہی چن نے دیکھا تو سمندر کی موجوں نے اسے ایک جزیرے میں لا پھینکا تھا۔ چن کے لیے یہ جزیرہ ایک اجنبی جگہ تھی مگر اس نے اس خیال سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کم از کم اسے زمین تو دکھائی دی ۔۔ وہ تختے کو دھکیلتا ہوا پایاب پانی میں لے گیا اور پھر اسے چھوڑ کر پانی سے باہر نکل آیا۔ اس نے چند لمحوں تک کھڑے کھڑے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا جزیرے میں پہنچ گیا جزیرہ بہت خوب صورت تھا۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا اور ہرے بھرے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا، یقیناً یہاں کوئی آبادی بھی ہوگی۔ اس خیال سے اس نے ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر چاروں جانب نظریں دوڑائیں مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں نہ کسی آبادی کے آثار تھے اور نہ دُور دُور تک کسی آدم زاد کا پتہ چل رہا تھا۔ اس وقت چن کو شدت کی بھوک لگ رہی تھی اس لیے وہ جنگلی پھل پھلاری کی تلاش میں گھومنے لگا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گیا تھا کہ اتنے میں کسی طرف سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور اس کے قریب ہی ایک درخت میں ترازو ہوگیا۔ چن گھبرا سا گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں نہ کوئی آبادی تھی اور نہ کوئی آدم زاد دکھائی دے رہا تھا، وہاں یہ تیر کہاں سے آیا ۔۔؟ اس نے گھبراہٹ

میں چاروں طرف دیکھا اور ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ اسے ایک جانب سے گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سُنائی دی ۔ اس نے اندازہ کیا کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اسی کی جانب آ رہی ہے ۔ یہ جان کر وہ جلدی سے قریب کی جھاڑیوں میں چھپ گیا ۔ وہ جھاڑیوں میں اس طرح چھپا تھا کہ اسے کوئی نہ دیکھ سکے مگر وہ آنے والے کو آسانی سے دیکھ سکے ۔ جوں جوں ٹاپوں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی توں توں گھوڑوں کی رفتار بھی آہستہ ہوتی جا رہی تھی ۔۔۔ پھر چند ہی لمحوں بعد چن نے دیکھا کہ یہ نوجوان لڑکیوں کا ایک گروہ تھا جو سب کی سب گھوڑوں پہ سوار تھیں ۔ وہ ہنستی کھلکھلاتی ایک دوسری سے چُہلیں کرتی ہوئی چلی آ رہی تھیں ۔ یہ سب لڑکیاں سُرخ لباس پہنے ہوئے تھیں اور ایک سے ایک بڑھ کر حسین تھیں ۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کمان تھی اور شانوں پر تیروں سے بھرے ہوئے ترکش لٹک رہے تھے ۔ یوں تو ان میں سے ہر لڑکی اپنی جگہ حسین تھی مگر ان کے درمیان ایک لڑکی ایسی تھی جو حسن و جوانی میں سب سے زیادہ آگے تھی ۔ جوں ہی چن کی نظر اس لڑکی پہ پڑی وہ اس کے دل میں جیسے کھُب سی گئی ۔ لڑکی اسے اس قدر پسند آئی تھی کہ اگر وہ اس وقت مجبور و بے بس نہ ہوتا تو شاید آگے بڑھ کر اسے اپنے دل کا حال سُنا دیتا ۔ جب لڑکیاں ہنستی اور باتیں کرتی ہوئیں چن کے قریب سے گزر گئیں تو وہ ہولے سے جھاڑیوں کی اوٹ میں سے باہر آیا ۔ اس نے ادھر ادھر راستہ دیکھا ، اور چُھپتا چھپاتا ، نظریں بچاتا ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ۔ لڑکیوں کے گھوڑوں کی رفتار چونکہ آہستہ ہو چکی تھی اس لیے چن کو ان کا پیچھا کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی ۔ اس وقت وہ صرف اس بات سے ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے ۔ ادھر لڑکیاں اپنی باتوں میں اتنی مصروف تھیں کہ انھیں کسی کی خبر تک نہ تھی ۔ انھیں اس کا احساس تک نہ ہو سکا کہ کوئی ان کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے اور چن بھی یہی چاہ رہا تھا ۔

لڑکیاں اسی طرح باتوں میں مشغول چلتی رہیں اور چن ان کا تعاقب کرتا رہا ۔ یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا ۔ یہ جنگل کی آخری حد تھی اور یہاں سے آگے کھلی جگہ تھی

جہاں ہر طرف چھوٹی چھوٹی ہری گھاس اُگی ہوئی تھی ۔ اس مقام پہ پہنچ کر تمام لڑکیاں رُک گئیں پھر وہ سب کی سب اپنے اپنے گھوڑے سے نیچے اُتر آئیں اور ایک صاف ستھری جگہ دیکھ کر بیٹھ گئیں ۔۔۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تھک جانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کے لیے رُک گئی ہوں ۔ چن دُور درختوں کی اوٹ میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے ، یہ لڑکیاں کون ہیں اور یہاں کیا کرتی پھر رہی ہیں ؟ یہی کچھ سوچتے سوچتے اسے ایک بار پھر بھوک کا شدت سے احساس ہونے لگا ۔ وہ ان لڑکیوں کے پاس تو جا نہیں سکتا تھا چنانچہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا ۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اس سے کچھ فاصلے پہ ایک لڑکا کھڑا تھا جس کے ساتھ کئی شکاری کُتّے بھی تھے ۔ چن نے اندازہ کیا کہ ہو نہ ہو یہ کُتّے بھی ان لڑکیوں کے ہیں اور لڑکا ان کی نگرانی کر رہا ہے ۔۔۔ اب وہ اس سوچ میں پڑ گیا کہ اگر میں لڑکے کے پاس جاؤں تو کہیں ایسا نہ ہو کُتّے مجھ پہ جھپٹ پڑیں ۔۔۔ ! لیکن اسے بھوک بھی بڑے زور کی لگ رہی تھی ۔۔۔ آخر اس نے ہمّت کی اور دبے دبے قدموں سے اس لڑکے کے پاس جا پہنچا ۔

" تم کون ہو ۔۔۔ ! اور یہاں کیسے آئے ہو ۔۔۔ ؟ "

لڑکے نے چن کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے سوال کیا ۔

" میں ایک اجنبی ہوں ۔۔۔ میری کشتی سمندر میں غرق ہو گئی ہے ۔۔۔ مجھے بتاؤ یہ کون سی جگہ ہے ۔۔۔ ؟ "

چن نے جواب دینے کی بجائے بڑی بے تابی سے اُلٹا لڑکے سے دریافت کیا جواب میں لڑکا بولا ۔

" یہ ایک جزیرہ ہے ۔۔۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ یہاں کسی اجنبی کا آنا خطرے سے خالی نہیں ہے ۔ "

پھر وہ جلدی سے کہنے لگا ۔

" خدا کے لیے جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ ۔۔۔ ؟ "

اس پہ چن جو بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا ، التجا کے لہجے میں کہنے لگا ۔

"میں بہت بھوکا ہوں — مجھے کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں کچھ کھانے پینے کو مل جائے —؟"

یہ بات سُن کر لڑکے کو چمن کی بے بسی پر رحم آگیا - اس نے جلدی جلدی اپنا تھیلا کھولا اور اس میں سے تھوڑا کھانا نکال کر چمن کو دیا - اس کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔

"میری مانو اور جلد سے جلد یہاں سے دُور نکل جاؤ —؟"

"وہ کیوں —؟"

چمن نے جلدی جلدی لقمے لیتے ہوئے کہا۔ وہ حیران بھی تھا اور پریشان بھی — اتنی مصیبتوں کے بعد تو اسے زمین ملی تھی۔ بھلا اب وہ کہاں چلا جائے —؟ لڑکے نے چمن کو اس طرح حیران و پریشان دیکھا تو قدرے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

"آج شہزادی اپنی سہیلیوں کے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے نکلی ہے — وہ سب درختوں کے اس طرف بیٹھی سستا رہی ہیں — اگر کسی نے تمھیں یہاں دیکھ لیا تو ناحق مارے جاؤ گے — اس لیے میری بات مان لو اور یہاں سے کہیں دُور نکل جاؤ —؟"

لڑکے کی بات سُن کر چمن سوچ میں پڑ گیا اور اسے خاموش دیکھ کر لڑکا آہستہ سے بولا۔

"دیکھو — بے وقوفی مت کرو — اور میرے کہنے پر عمل کرو —؟"

چمن نے اس کی بات تو مان لی لیکن سوال کیا۔

"اچھا، مجھے اتنا تو بتا دو کہ میں کس طرف کو جاؤں —؟"

"جس طرف تمھاری مرضی ہے چلے جاؤ مگر اس جانب مت جانا جدھر شہزادی اور اس کی سہیلیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔"

لڑکے نے گھبراہٹ میں جلدی سے کہا — وہ چمن سے باتیں بھی کر رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس جانب بھی دیکھتا جا رہا تھا جدھر شہزادی اور اس کی

سہیلیاں بیٹھی تھیں۔ چن نے اس لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے ایک سمت کو چل دیا۔

اب چن کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اسے کہاں جانا چاہیے؟ وہ تھوڑی دیر تک ایک سمت کو چلتا رہا۔ ابھی اس نے کچھ زیادہ سفر طے نہیں کیا تھا کہ اس نے دیکھا۔ وہاں سے کچھ دور ایک بہت بڑی عمارت نظر آ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر چن کی ڈھارس بندھی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ یقیناً اس عمارت میں کوئی رہتا ہوگا۔ مجھے کچھ کھانے کو بھی مل جائے گا اور پناہ بھی حاصل ہو جائے گی —— یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ قدم اُٹھاتا ہوا اس عمارت کی جانب چلنے لگا۔ جب وہ اس عمارت کے قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ کوئی عام سی عمارت نہیں تھی بلکہ ایک عالی شان محل تھا۔ وہ جوں جوں اس کے قریب پہنچ رہا تھا، اسے محل کی بلندی اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ محل کے چاروں طرف ایک اونچی فصیل تھی۔

"اس جزیرے میں یہ محل کس کا ہو سکتا ہے —؟"

وہ اپنے دل ہی دل میں سوچتا ہوا اس محل کے پاس پہنچ گیا — محل کے باہر اور دور و نزدیک کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر سے دیوار کا جائزہ لیا تو ایک جگہ دیوار میں دروازہ نظر آیا جو آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہ چند لمحوں تک کھڑا یہی سوچتا رہا کہ دروازے کے اندر جاؤں یا نہ جاؤں —؟ آخر اس نے ہمت کی اور محل کی چار دیواری میں داخل ہو گیا۔ جوں ہی وہ اندر گیا، اس نے دیکھا چار دیواری کے اندر ایک وسیع اور خوب صورت باغ تھا۔ جس میں رنگا رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس نے سامنے نظر ڈالی تو وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر محل کا صاف ستھرا زینہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس زینے کے پاس ہی ایک خوب صورت جھولا لٹک رہا تھا۔ سارے محل کی آن بان دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ چن تعجب اور شوق میں ڈوبا ہوا یہ سب کچھ دیکھ

رہا تھا ۔۔۔ ابھی وہ جی بھر کے محل کی آرائش و زیبائش دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ اسے محل کی فصیل کے باہر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سُنائی دی اور اس کے ساتھ ہی لڑکیوں کے کھنکھناتے ہوئے قہقہے بھی سُنائی دینے لگے۔ اس نے دل میں سوچا کہیں ایسا نہ ہو یہ محل اسی شہزادی کا ہو جس کے بارے میں لڑکے نے بتایا تھا اور اب وہ سہیلیوں کے ساتھ شکار سے واپس آ رہی ہو ۔۔۔؟ اتنا سوچتے ہی وہ جلدی سے قریب ہی پودوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

واقعی چن نے ٹھیک سوچا تھا ۔۔۔ وہی لڑکیاں ہنستی کھیلتی اور قہقہے لگاتی اندر آ رہی تھیں جنھیں وہ جنگل کی حد پہ چھوڑ آیا تھا۔ اس نے پودوں کی اوٹ میں چھپے چھپے دیکھا تو لڑکیاں باغ میں سے ہوتی ہوئی محل کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کے درمیان وہی حسین لڑکی تھی جو چن کو بہت اچھی لگی تھی ۔۔۔ اب تو اسے پورا پورا یقین ہو چکا تھا کہ یہی شہزادی ہے اور باقی اس کی سہیلیاں یا کنیزیں ہیں۔

جب باری باری تمام لڑکیاں محل کے اندر چلی گئیں تو چن آہستہ سے پودوں کی اوٹ میں سے باہر آ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو دیکھا، اس سے چند گز دُور ایک سُرخ ریشمی رومال پڑا ہوا تھا۔ چن نے آگے بڑھ کر وہ رومال اُٹھا لیا۔ رومال دیکھتے ہی اس نے پہچان لیا کہ اسی قسم کے رومال شہزادی اور اس کی سہیلیوں نے اپنے سروں پہ باندھ رکھے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنے آپ سے کہا۔

"شاید یہ رومال شہزادی کا ہو اور جاتے میں اس کے سر سے گر پڑا ہو؟"

یہی سوچ کر وہ رومال اُٹھا کر ہولے ہولے محل کی طرف چلنے لگا جب وہ محل کے برآمدے میں پہنچا تو اس نے دیکھا، ایک طرف میز پہ لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی سی خوب صورت میز تھی جس پہ روشنائی اور برش رکھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں کاغذ تو ہوتا نہیں تھا اس لیے لوگ خط وغیرہ ریشمی کپڑے پہ لکھا کرتے تھے۔ ریشمی کپڑے پہ برشوں سے ایک ایک

حرف بنا کر تحریر لکھی جاتی تھی اور اتفاق کی بات یہ کہ چن ایسی تحریر لکھنے میں بڑا ماہر تھا — اسے اس کام میں مہارت ہی کی وجہ سے تو جرنیل کے پاس ملازمت ملی تھی — چنانچہ جوں ہی اس نے یہ چیزیں دیکھیں، لمحہ بھر کے لیے ان کا جائزہ لیا اور پھر برش اُٹھا کر اس سُرخ ریشمی رومال پہ کچھ لکھنے لگا۔ اس نے نہایت خوش خطی سے اس پہ ایک شعر تحریر کر دیا — چن شعر بھی کہہ لیتا تھا اور یہ شعر اس کا اپنا تھا۔ شعر لکھنے کے بعد اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور رومال میز پہ رکھ کر سوچنے لگا۔

"اب یہاں سے کھسک جانا چاہیے — ایسا نہ ہو کوئی مجھے دیکھ لے اور کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔"

وہ جلدی سے اس طرف لپکا جہاں چھوٹا سا دروازہ تھا اور جہاں سے وہ محل کی چار دیواری میں داخل ہوا تھا لیکن جوں ہی وہ وہاں پہنچا اس کا دل دھک سے رہ گیا کیوں کہ دروازے پہ تالا پڑا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر چن گھبرا گیا۔ اس نے گھبراہٹ اور خوف میں ادھر اُدھر دیکھا کہ شاید باہر جانے کا کوئی اور راستہ نظر آ جائے مگر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا — فصیل میں اور کوئی دروازہ نہیں تھا۔

"اب کیا کروں — ؟"

اس نے کھڑے کھڑے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر وہ ناچار محل کے برآمدے میں واپس آ گیا اور اس میز سے تھوڑی دور ایک ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ کھڑا ہوا ہی تھا کہ عین اس وقت ایک لڑکی محل سے باہر آئی۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی چیز تلاش کر رہی ہو — جوں ہی اس کی نظریں میز پہ پڑے ہوئے سُرخ رومال پہ پڑیں وہ قدرے خوش ہو کر بولی۔

"خدا کا شکر ہے مجھے شہزادی کا رومال مل گیا۔"

جب وہ رومال اُٹھانے کے لیے میز کی جانب بڑھی تو اچانک اس نے

قریب ہی کھڑے ہوئے چمن کو دیکھا - اس نے پہلے حیران ہو کر اسے دیکھا اور پھر پوچھا -

"تم کون ہو — اور یہاں کیا کر رہے ہو — ؟"

"میں ایک اجنبی ہوں !"

چمن نے سہمے سہمے انداز میں جواب دیا -

"مگر یہاں کیسے آئے ہو — ؟"

اس دفعہ لڑکی نے ذرا سخت لہجے میں سوال کیا -

"میں ایک غریب آدمی ہوں — میری کشتی طوفان میں ڈوب گئی ہے اور سمندر کی موجیں مجھے اس جزیرے میں لے آئی ہیں — میں غلطی سے محل میں پہنچ گیا ہوں کیوں کہ مجھے یہاں کے راستے نہیں معلوم !"

چمن نے بڑی عاجزی سے لڑکی کو جواب دیا اور پھر اس کی منت کرتے ہوئے بولا -

"میری اچھی بہن — خدا کے لیے میری مدد کرو — ؟"

لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ کر شہزادی کا رومال اٹھا لیا — اس نے رومال کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس پر شعر تحریر تھا — وہ بڑے غور سے شعر پڑھنے لگی اور پھر چمن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا -

"یہ تم نے کیا لکھا ہے — ؟"

"ایک شعر ہے !"

چمن نے آہستہ سے اس طرح کہا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہو -

"یہ شعر کس کا ہے — ؟"

"یہ شعر میرا ہے !"

اس پر لڑکی جلدی سے بولی -

"معاف کرو — اب میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی — یہ

رومال شہزادی کا ہے، وہ اپنا رومال دیکھتے ہی پوچھے گی کہ اس پر شعر کس نے لکھا ہے۔ وہ کون ہے اور کہاں ہے ـــــ؟ اگر اسے یہ پتہ چل گیا کہ کوئی اجنبی محل میں آیا ہے تو تمھاری خیر نہیں"

لڑکی نے اتنا کہا اور پیشتر اس کے کہ حتن کچھ کہتا، وہ تیزی سے محل کے اندر چلی گئی۔

حتن بے چارہ حیران و پریشان کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا، کیا کرے ـــــ؟ کہاں جائے ـــــ؟ ایک مصیبت یہ بھی کہ محل کا دروازہ بھی بند تھا۔ اور دوسرا یہ کہ وہ شہزادی کے رومال پر شعر لکھ کر ایک اور غلطی کر بیٹھا تھا۔ اگر شہزادی ناراض ہو گئی تو آج وہ جان سے گیا ـــــ وہ وہاں کھڑا دل ہی دل میں اس گھڑی کو پچھتا رہا تھا جب اس محل میں داخل ہوا تھا۔ وہ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں گرفتار تھا کہ اتنے میں وہی لڑکی واپس آئی۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی طشتری تھی اور اب اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات بھی نہیں تھے۔ وہ آتے ہی بولی۔

"شہزادی کو تمھارا شعر پسند آیا ہے لیکن ابھی وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ـــــ؟ اس کے لیے تمھیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا"

اتنا کہنے کے بعد اس نے کھانے کی طشتری حتن کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کھانا تمھارے لیے شہزادی نے بھیجا ہے"

اس نے یہ کہا اور اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی ـــــ حتن جس طرح پہلے حیرانی میں ڈوبا کھڑا تھا، اسی طرح اب بھی حیران تھا ـــــ شاید وہ ابھی کچھ دیر مزید اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہتا کہ اپنے سامنے کھانا دیکھ کر اس کی بھوک اور بھڑک اُٹھی ـــــ بھوکا تو تھا ہی اور اب جب کہ کھانا اس کے سامنے تھا اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو کے رہے گا — پیٹ بھر کے کھانا تو کھا لوں ۔"

کھانے میں طرح طرح کی چیزیں تھیں اور ہر چیز دوسری سے زیادہ لذیذ تھی۔ چمن نے اپنی بھوک سے بھی زیادہ پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور پھر دوسری صبح کے انتظار میں وہیں پڑ کے سو گیا ۔ دوسری صبح اس کے لیے کیا پیغام لاتی ہے —؟ زندگی یا موت؟ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا ۔ وہ فرش پہ بیٹھا ہوا انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا ۔ اگر عام حالات ہوتے تو شاید سو بھی نہ سکتا لیکن وہ پیدل سفر اور سمندر کی مصیبتوں سے انتہائی طور پہ تھک چکا تھا ۔ پھر شدید بھوک کے بعد اس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا اس لیے خوف کے باوجود نیند کی گود میں چلا گیا

اگلے روز اس کی آنکھ جلد ہی کھل گئی — ابھی بیدار ہی ہوا تھا کہ کل والی لڑکی سویرے ہی سویرے اس کے پاس آ گئی ۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ چمن پہلے ہی سے جاگ رہا ہے تو بولی ۔

"مجھے افسوس ہے — تمھارا بُرا وقت آ گیا ہے ۔"

"کیا ہوا —؟ میری اچھی بہن مجھے بتاؤ کیا ہوا —؟"

چمن نے گھبرا کے پوچھا — جواب میں لڑکی نے بتایا ۔

"کسی نے ملکہ سے چغلی کھائی ہے کہ تم کل سے محل میں موجود ہو — اس محل میں کوئی شخص اجازت کے بغیر نہیں آ سکتا اور اب جب کہ ملکہ کو بھی پتہ چل گیا ہے تو —!"

"پھر اب کیا ہو گا —؟"

چمن نے گھبرا کے لڑکی کی بات کاٹ دی ۔

"مجھے ڈر ہے کہ تمھیں بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا ۔"

لڑکی نے اتنا کہا اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی ۔ چمن ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے ، اتنے میں محل کے دو پہریدار آئے ۔ انھوں نے آتے ہی نہ کچھ پوچھا ، نہ سُنا اور چمن کی مشکیں کس لیں ۔ کرنا

خدا کا ایسا ہوا کہ ان پہریداروں کے ساتھ ملکہ کی ایک خاص کنیز بھی تھی۔
جوں ہی اس کی نظر چن پہ پڑی اس نے فوراً اسے پہچان لیا اور خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا تم چن ہو ——؟"

"ہاں ——! میرا نام چن ہے!"

چن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیران ہو کر جواب دیا۔ چن کو تعجب ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے جو اس کا نام جانتی ہے ——؟ لڑکی نے چن کی گھبراہٹ دیکھی تو اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"تم گھبراؤ نہیں —— میں ابھی جا کر تمھارے بارے میں ملکہ کو بتاتی ہوں"
اس کے بعد اس نے پہریداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی مشکیں کھول دو —— اور اسے عزّت کے ساتھ ملکہ کے پاس لاؤ۔"

لڑکی کے کہنے پہ پہریداروں نے چن کی مشکیں کھول دیں مگر وہ حیران تھے کہ یہ نوجوان کون ہے جو بغیر اجازت محل میں گھس آیا ہے اور پھر بھی اسے عزّت سے ملکہ کے پاس لے جایا جا رہا ہے ——؟ انھوں نے چن کو لا کر ملکہ کے حضور پیش کر دیا جوں ہی ملکہ نے چن کو دیکھا وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور بڑی گرم جوشی سے چن کا استقبال کیا۔ اسے بڑی عزّت سے اپنے پاس بٹھایا اور پھر کہا۔

"شاید تم حیران ہو گے کہ میں نے تمھیں کیسے پہچان لیا ہے ——؟ گھبراؤ نہیں میں تمھیں سب کچھ بتاتی ہوں۔"
اس کے بعد اس نے بڑے پیار سے چن کو بتایا۔

"میں اس جزیرے پہ حکومت کرنے والے بادشاہ کی ملکہ ہوں۔ میں پچھلے سال اپنے ماں باپ سے ملنے گئی تھی —— وہ ایک بڑے دریا پہ حکومت کرتے

ہیں۔ چوں کہ سفر طویل اور مشکل تھا اس لیے اپنے سفر کو مختصر اور آسان بنانے کے لیے میں نے ڈالفن مچھلی کا روپ دھار لیا تھا ۔۔۔ وہی ڈالفن جسے تم نے چھوٹی مچھلی سمیت جرنیل کے ہاتھوں سے چھڑا کر زخموں پہ مرہم پٹّی کی تھی اور دوبارہ سمندر میں ڈال دیا تھا ۔۔۔ وہ چھوٹی مچھلی جو اس وقت میری دُم سے چپکی ہوئی تھی، دراصل میری خاص کنیز تھی ۔۔۔ اسی کنیز نے آج تمھیں اس وقت پہچان لیا جب پہریدار تمھیں گرفتار کرنے گئے تھے ۔۔۔ اور میں بھی تمھیں دیکھتے ہی پہچان گئی۔"

ملکہ کی یہ بات سُن کر حسن کی تمام حیرانی دُور ہو گئی ۔ وہ معمّہ جس میں وہ کل سے اُلجھا ہوا تھا خود بخود حل ہو گیا ۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوا ۔ جب اس نے ڈالفن مچھلی کی جان بچائی تھی ، اس وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی جزیرے کی ملکہ ہو گی اور کبھی اس کی جان بھی بچائے گی

ملکہ نے اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھی تو کہا ۔

"تم ہمارے مہمان ہو ۔۔۔ تمھیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی ۔"

پھر وہ اس سے پوچھنے لگی ۔

"اب یہ بتاؤ کہ تمھاری سب سے پیاری تمنا کیا ہے ۔۔۔؟ اس جزیرے کا بادشاہ تمھاری ہر خواہش پوری کرے گا ۔۔۔؟"

جوں ہی حسن نے ملکہ کی یہ بات سُنی ، اُسے فوراً اس خوب صورت شہزادی کا خیال آیا جسے اس نے سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا اور جس کے سُرخ رومال پہ اس نے اپنا شعر لکھا تھا ۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ شہزادی اس کے دل میں بس گئی تھی مگر وہ یہ بات ملکہ سے نہ کہہ سکا ۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گیا ۔ ملکہ نے پھر کہا ۔

"گھبراؤ نہیں ۔ تمھاری جو بھی تمنا ہے بلا خوف کہہ دو ۔۔۔؟"

حسن ابھی تک دل کی بات کہنے سے جھجھک رہا تھا ۔۔۔ یہ دیکھ کر ملکہ نے پوچھا ۔

"کیا وہ شعر تمھارا تھا جو تم نے سُرخ رومال پر لکھا تھا ۔۔۔؟"

"جی ہاں ملکہ عالیہ —— وہ شعر میرا ہی تھا"
چمن نے بڑے ادب سے جواب دیا —— ملکہ نے فوراً ایک کنیز کو حکم دیا۔
"شہزادی کو بلایا جائے ——!"
ملکہ کے حکم کی دیر تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہی حسین شہزادی چمن کے سامنے تھی جس کو پہلی بار دیکھتے ہی وہ دل دے بیٹھا تھا —— ملکہ نے شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
"پیاری بیٹی! کیا تم اس نوجوان کو پہچانتی ہو ——؟"
اور پھر بیشتر اس کے کہ شہزادی کوئی جواب دیتی ملکہ خود ہی بولی۔
"یہ وہی نوجوان ہے جس کا شعر تمھیں بہت پسند آیا ہے —— اس کا نام چمن ہے اور یہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے ——؟"
دراصل ملکہ چمن کا لکھا ہوا شعر پڑھ کر اور اس وقت اس کے چہرے سے دل کی کیفیت جان کر ہی سب کچھ سمجھ گئی تھی —— پھر وہ چمن کی نیکی، شرافت اور رحم دلی کی بھی قائل تھی —— وہ خوب صورت اور جوان بھی تھا اور ملکہ اس کے احسان کو بھی نہیں بھولی تھی جو اس نے ڈالفن کی جان بچا کر کیا تھا —— شہزادی کو اس سے اچھا زندگی کا ساتھی نہیں مل سکتا تھا —— دوسری طرف شہزادی کو بھی چمن بہت پسند آیا تھا۔ وہ تو اپنے رومال پہ لکھا ہوا شعر پڑھ کر ہی اس کو چاہنے لگی تھی اور اب جب کہ اس نے چمن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو دل و جان سے اس کی ہو گئی تھی —— لہٰذا چند ہی روز میں بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی کر دی گئی —— چمن کو ایک مچھلی کی جان بچانے کا صلہ یہ ملا کہ وہ غریب سیکرٹری سے ایک شہزادہ بن گیا۔
شادی کے بعد وہ اسی جزیرے میں رہنے لگا لیکن سال میں ایک بار اپنے ماں باپ سے ضرور ملنے جاتا۔ وہ جب بھی ان سے ملنے کے لیے جاتا اپنے ساتھ قیمتی تحائف اور دوسری چیزیں بھی لے جاتا اور چند روز والدین کے پاس رہ کر پھر واپس آجاتا —— چمن کے بوڑھے ماں باپ اس کی دولت اور شان و شوکت سے بہت خوش تھے لیکن چمن نے انھیں یہ کبھی نہیں بتایا کہ جو قیمتی چیزیں

اور تحفے وہ لاتا ہے اور اس کی یہ تمام شان و شوکت کہاں سے آئی ہے —؟"

اس بات کو صدیاں بیت چکی ہیں —— اس وقت سے لے کر آج تک لوگ ڈالفن مچھلی کا شکار نہیں کرتے۔ کسی نے کبھی کسی ڈالفن کو تیر سے زخمی نہیں کیا بلکہ وہ اس سے پیار کرتے ہیں —— شاید اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے — یہ بھی کسی جزیرے کی ملکہ ہو جو اپنے ماں باپ سے ملنے جا رہی ہو۔

انجمن کی زیرِ طبع کتابیں

گلِ رعنا:- تصنیف مرزا غالب مرتبہ سید قدرت نقوی۔ غالب کی اہم تصنیف "گلِ رعنا" کے مخطوطے کا عکس مرتب کے مقدمے کے ساتھ رسالۂ اردو میں بالاقساط چھپ چکا ہے اب اس کو کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ بہت جلد یہ کتاب منظرِ عام پر آجائے گی۔ کتاب میں اصل کے عکس کے علاوہ حسبِ ذیل عنوانات ہیں: مقدمہ از مرتب۔ نستعلیق متن۔ اختلافِ نسخ و سیر حاصل بحث

کہانی رانی کیتکی:- مرتبہ سید قدرت نقوی۔ اس کہانی کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں اب تیسرا ایڈیشن ہر لحاظ سے مکمل و مستند ہے۔ اس ایڈیشن کی تصحیح مولانا امتیاز علی عرشی نے دو قدیم نسخوں سے مقابلہ کر کے کی ہے اس کے متن کی مزید تصحیح و تشریح سید قدرت نقوی نے کی اور حاشیے لکھ کر اس میں جامعیت پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کر دی ہے۔ اس سے قارئین اور خاص کر اردو کے طلبہ کے لیے خاصی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ شروع میں بابائے اردو کا سابقہ مقدمہ اور مرتب کا دیباچہ بھی شامل ہے

تذکرہ عروس الاذکار:- مرتبہ افسر صدیقی امروہوی نقش حیدرآبادی کے اس نایاب اور معاصر شعراء کے تذکرے کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو میں ہے۔ جسے جناب افسر امروہوی نے کافی محنت اور دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ تذکرے کے آخر میں طویل حواشی دیئے گئے ہیں جن میں اس تذکرے میں شامل شعرا کے بارے میں مختلف خارجی ذرائع سے بھی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔

تذکرۂ شامِ غریباں:- تصنیف لچھمی نرائن شفیق مرتبہ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی (استاد جامعہ عثمانیہ)۔ یہ شعرائے فارسی کا مبسوط و ضخیم تذکرہ ہے جس میں مولف نے ایران کے ان شعرائے فارسی کا تذکرہ قلم بند کیا ہے جو برِصغیر کے مختلف بلاد و امصار میں وارد ہوئے تھے۔ شروع میں مرتب کا فاضلانہ مقدمہ شامل ہے۔ اور تقریباً ہر شاعر کے بارے میں مرتب نے دوسرے تذکروں کے حوالوں سے اس تذکرے کو جامع بنا دیا ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان - بابائے اردو روڈ - کراچی نمبر ۱